مرقع غالب

مرتبہ
پرتھوی چندر

مُرقع غالب

مع حواشی

تلمیحات و تشریحاتِ اشعار مندرجہ مکتوبات
و عکسِ خطوطِ منتخب نوشتہ مرزا غالب

مُرتبہ

پرتھوی چندر

اشاعت پہلی بار
سال ۱۹۶۶ء
تعداد دو ہزار
مطبوعہ لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی
خوش نویس حفیظ صدیقی

ملنے کے پتے
۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: جامعہ نگر، نئی دہلی
اردو بازار، دہلی ۶
۲۔ لکشمی بک سٹور، ۷۲ جن پتھ۔ نئی دہلی

قیمت:۔ ۱۴/-

پرتھوی چندر
۷۲ جن پتھ، نئی دہلی

مرزا اسد اللہ خاں غالب

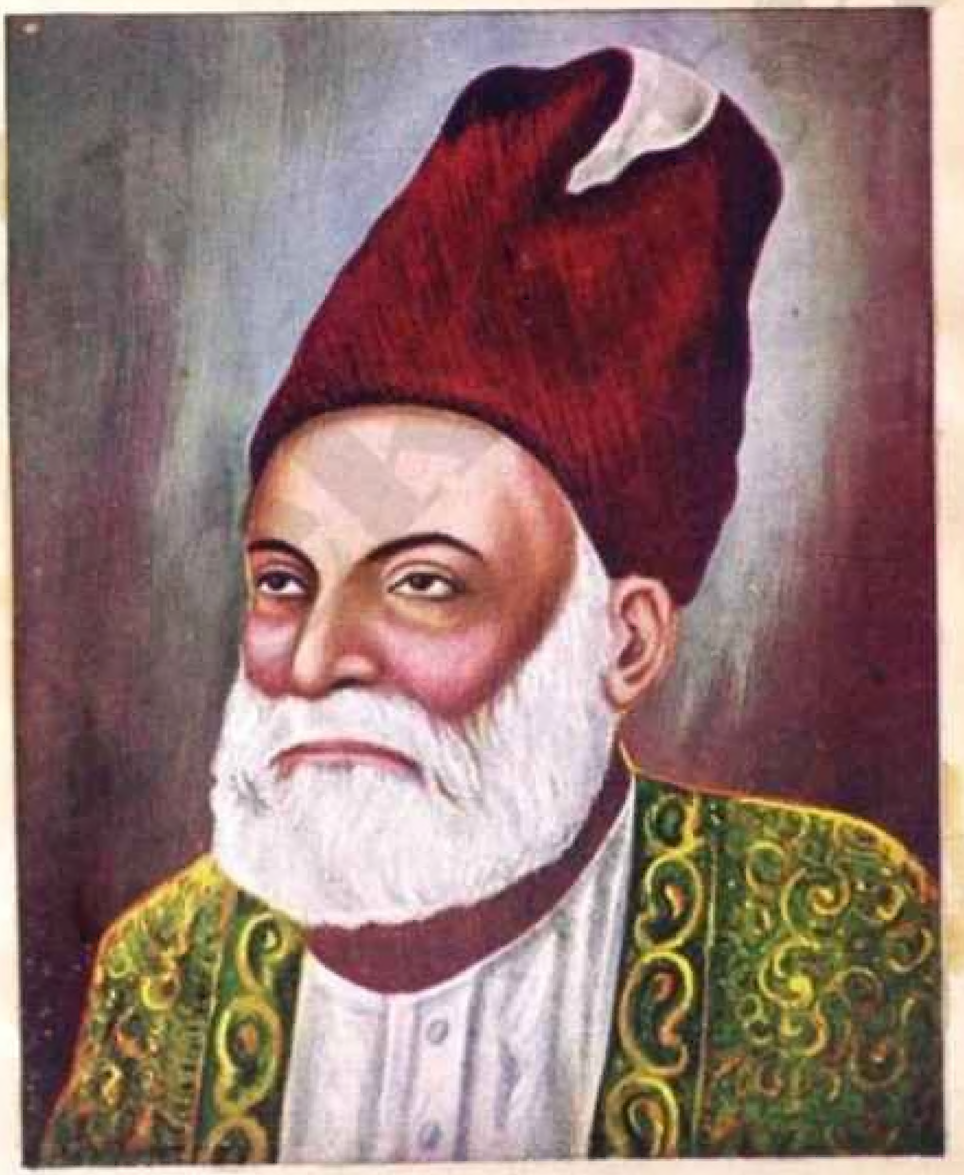

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال ہیں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

نورِ بصر راحتِ جان فرزندِ اقبال نشان

وید پرکاش. جی

کے نام

جن کی عقیدت اور لگن نے اس کام کو
انجام دیا اور اُن کی سُلجھی ہوئی
فوٹوگرافی نے

مکتوباتِ مرزا

اور

مرقعِ غالب کو مرصّع کیا

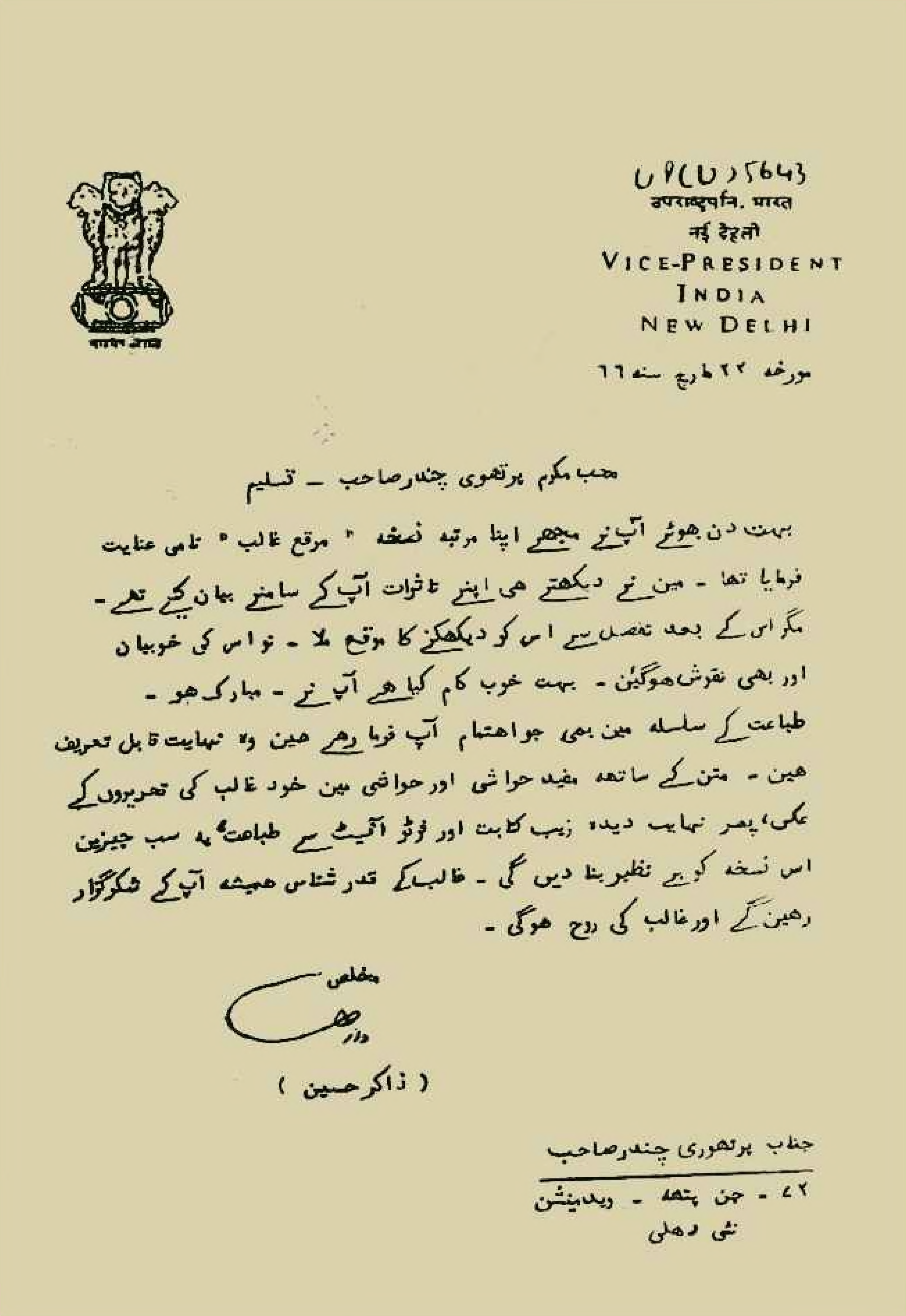

UP(U)5643
उपराष्ट्रपति, भारत
नई देहली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۶۶

محب مکرم پرتھوی چند صاحب ـ تسلیم

بہت دن ہوئے آپ نے مجھے اپنا مرتبہ نسخہ " مرقع غالب " نامی عنایت فرمایا تھا - مین نے دیکھتے ہی اپنے تاثرات آپ کے سامنے بیان کیے تھے - مگر اس کے بعد تفصیل سے اس کو دیکھنے کا موقع ملا - تو اس کی خوبیاں اور بھی نقوش ہوگئیں - بہت خوب کام کیا ہے آپ نے - مبارک ہو -

طباعت کے سلسلہ مین بھی جو اہتمام آپ فرما رہے ہین وہ نہایت قابل تعریف ہین - متن کے ساتھ مفید حواشی اور حواشی مین خود غالب کی تحریروں کے عکس، پھر نہایت دیدہ زیب کتابت اور فوٹو آفسیٹ سے طباعت، یہ سب چیزیں اس نسخہ کو بے نظیر بنا دیں گی - غالب کے قدر شناس ہمیشہ آپ کے شکرگزار رہین گے اور غالب کی روح ہوگی -

مخلص

(ذاکر حسین)

جناب پرتھوری چند صاحب
۷۲ - جن پتھ - ویدینشن
نئی دہلی

Dr Zakir Husain receiving the first copy of a new compilation of Ghalib's verse and letters from Mr Prithvi Chandra, the author, in New Delhi on Monday.—Statesman.

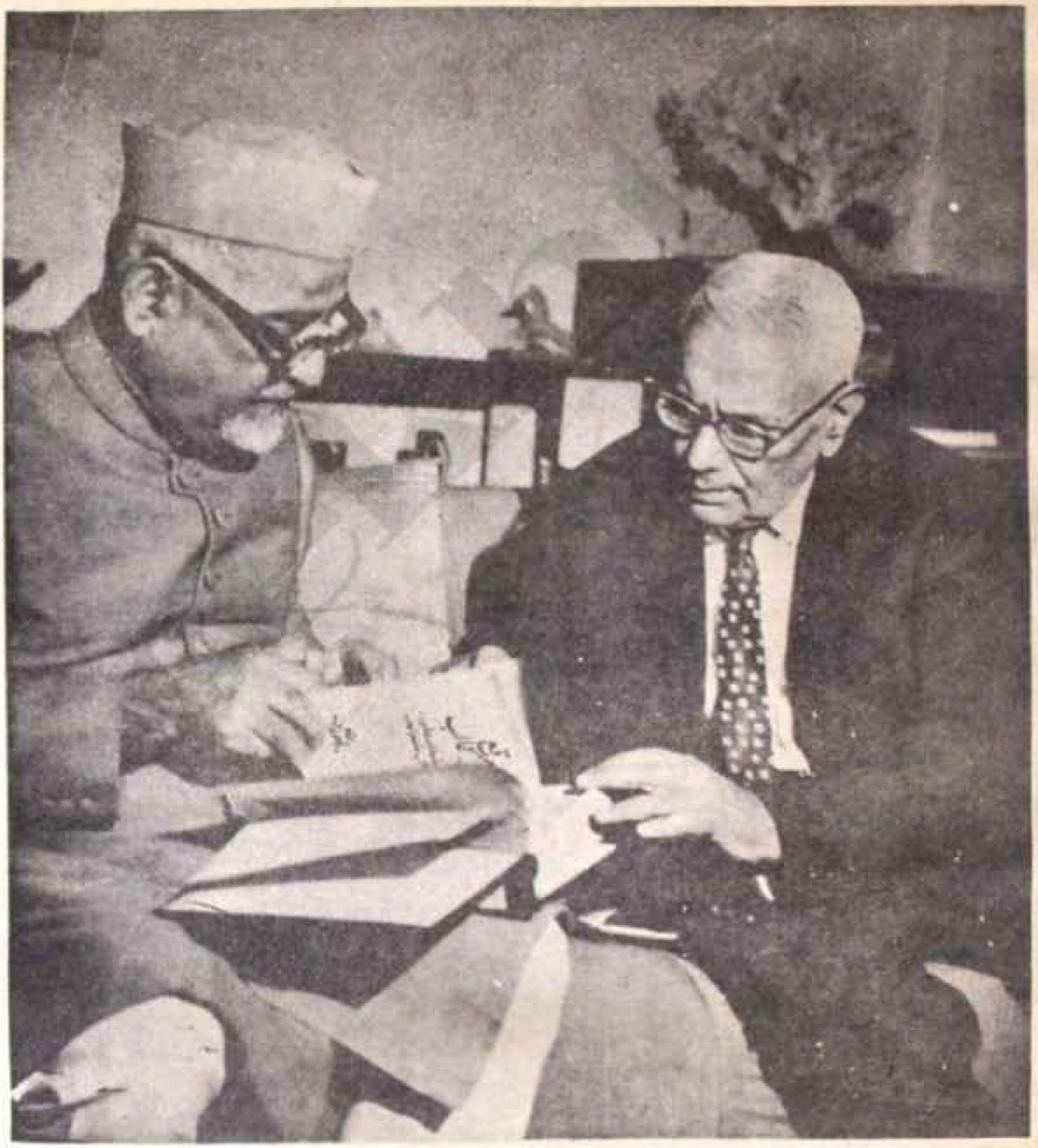

پرتھوی چندر جی کی مہربانی سے اس
دیدہ زیب مرقع کی زیارت نصیب ہوئی !
خوش باش کہ وقت ، خوش آری ۔

ذاکر حسین

۱۰ فروری ۱۹۶۹ء

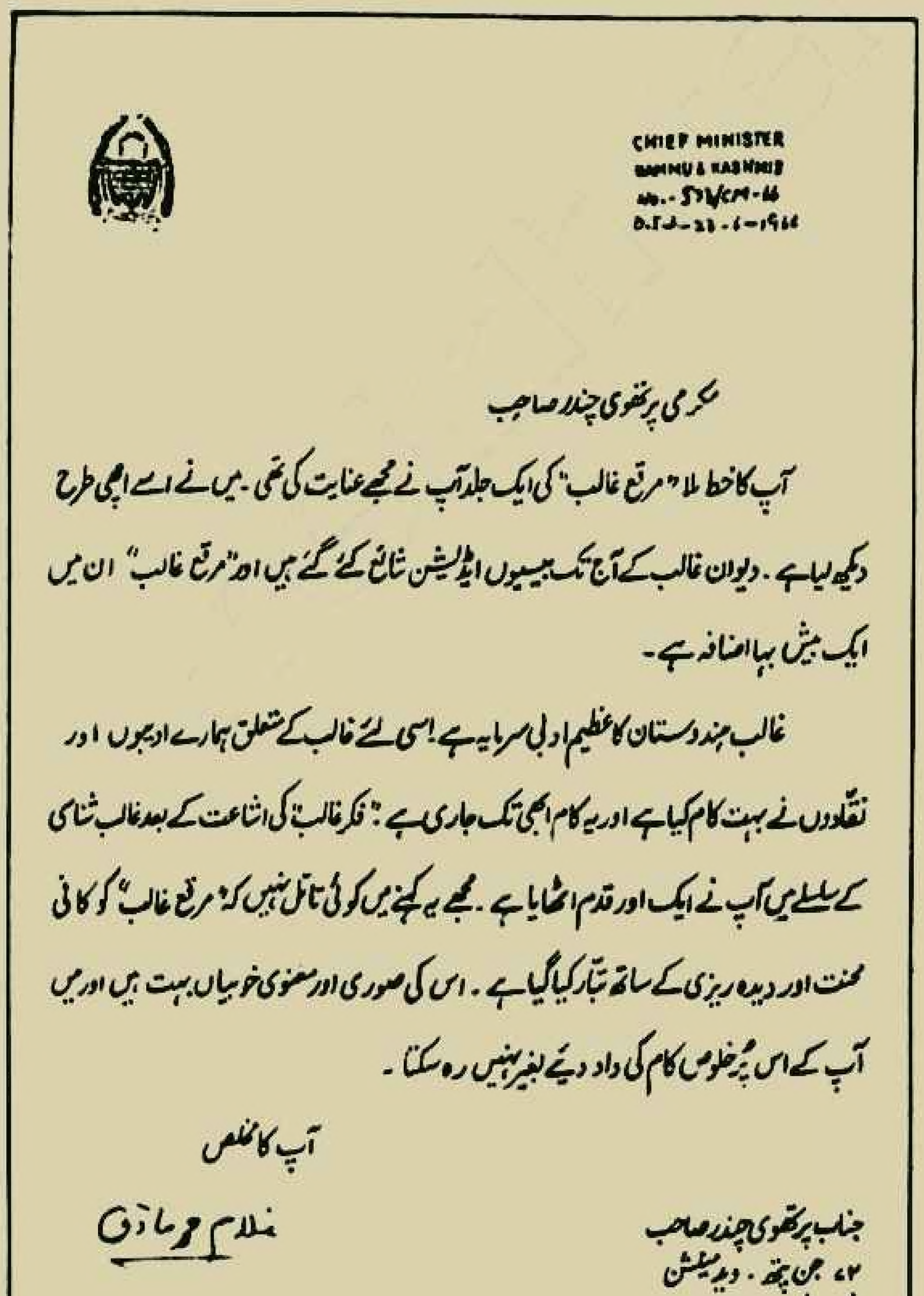

CHIEF MINISTER
JAMMU & KASHMIR
No.- 571/CM-66
Dated-23-6-1966

مکرمی پرتھوی چندر صاحب

آپ کا خط ملا "مرقع غالب" کی ایک جلد آپ نے مجھے عنایت کی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ دیوان غالب کے آج تک بیسیوں ایڈیشن شائع کئے گئے ہیں اور "مرقع غالب" ان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

غالب ہندوستان کا عظیم ادبی سرمایہ ہے۔ اسی لئے غالب کے متعلق ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے بہت کام کیا ہے اور یہ کام ابھی تک جاری ہے۔ "فکر غالب" کی اشاعت کے بعد غالب شناسی کے سلسلے میں آپ نے ایک اور قدم اٹھایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ "مرقع غالب" کو کافی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ اس کی صوری اور معنوی خوبیاں بہت ہیں اور میں آپ کے اس پُرخلوص کام کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کا مخلص

غلام محمد صادق

جناب پرتھوی چندر صاحب
۲، جن پتھ۔ ویدیلش
نیو دہلی

جناب پرتھوی چندر کی کتاب **فکر غالب** ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اب دہلی ہی سے ان کی دوسری کتاب **مرقع غالب** شائع ہو رہی ہے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے یہ کتاب اس قدر آراستہ ہے کہ مرزا غالب زندہ ہوتے تو اسے دیکھ کر معلوم نہیں ان کی مسرت کا کیا عالم ہوتا۔

مرزا کی تصانیف میں دیوان اردو کو ہر زمانے میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کے نت نئے اڈیشن نکلتے رہتے ہیں۔ اور خواص و عوام میں مقبول ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جناب مالک رام اور جناب امتیاز علی عرشی کے اڈیشن اپنے گوناگوں محاسن کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے ہیں، اب جناب پرتھوی چندر کا مرتب کردہ دیوان غالب شائع ہو رہا ہے جس میں انھوں نے یہ جدت کی ہے کہ مرزا غالب کے خطوط میں جہاں کہیں انہیں اشعار کی تشریح ملی ہے اسے حواشی میں درج کر دیا ہے، اور بعض مقامات پر وہ عبارتیں بخط غالب درج ہیں، اس طرح اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا، یہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، دیوان کی ابتدا میں غالب کے سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ بھی ہے۔ غالب کے ان مکاتیب کے عکس کتاب کے آخر میں دے دیے گئے ہیں جو انھوں نے نوابان رامپور کو لکھے ہیں، اور دار الانشا رام پور میں غالب کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، ان مکاتیب کا دیوان اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ علیحدہ شائع ہوتے تو بہتر ہوتا ـــــ لیکن اچھی چیز بہر حال اچھی ہوتی ہے، اور یہاں اس مجموعہ میں ان کا شمول افادیت سے خالی نہیں،

مجھے یقین ہے جناب پرتھوی چندر کا یہ کارنامہ غالب کے قدردانوں میں خاص طور پر ادبی حلقوں میں عام طور پر بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہو گی جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

مختار الدین احمد

ادارہ علوم اسلامیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۹ جون ۱۹۶۶ء

دیباچہ

مرزا غالب کی شاعرانہ شخصیت کو کسی خاص تعریف و تعارف کی ضرورت نہیں، اُن کا درجۂ سخنوری ہر طرح کی توصیف سے بالا تر ہے۔ اُن کی جدت پسند طبیعت نے اُردو نظم و نثر دونوں میں وہ امتیازی شان پیدا کی کہ اس کا جواب نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مرزا کی حیات میں اُن کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، تاہم وفات کے بعد جب علم و ادب کی ترقی کے ساتھ فکر و نظر کی راہیں کشادہ ہوئیں تو غالب کی شخصیت و عظمت اُبھرنے اور نکھرنے لگی۔ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں غالب پر مقالہ لکھا اور خواجہ حالی نے یادگارِ غالب پیش کی تو ہر ادیب کی فکر و نظر غالبیت کی طرف جانے لگی، یہاں تک کہ شارحین و اہلِ قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب اور کلامِ غالب پر مایۂ ناز کتابیں وجود میں آگئیں۔ ہر شائقِ ادب اور صاحبِ تحقیق نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق نئے نئے زاویوں سے کلامِ غالب کو پیش کیا ہے، اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شعرائے اردو میں غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور کسی دوسرے شاعر کو ایسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

اور یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام شعرائے اردو کے کلیات، دواوین اور مجموعہ ہائے کلام میں دیوانِ غالب ہی ایک ایسا نسخہ ہے جو سب سے زیادہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ۱۸۴۱ء سے اب تک نہ جانے اس کے کتنے اچھے اور بُرے، سادہ و پرکار، صحیح و غلط، گران و ارزاں، چھوٹے اور بڑے نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ نسخے اپنے ظاہری رنگ روپ میں ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ان کے متن میں بھی فرق ہے کیونکہ جب بھی کوئی نیا نسخہ شائع ہوتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو اور نئی تحقیق پائی جاتی ہے۔

مجھے شروع سے ہی کلامِ غالب سے دلچسپی رہی ہے اور اس سلسلہ میں جو بھی تصنیف و تالیف ہاتھ آئی اُس کا مطالعہ غائر نظر سے کرتا رہا ہوں اور اسی ذوق کی بنا پر 'فکرِ غالب' کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے جس کو غالب کے قدر دانوں کے حلقے میں کافی پسند کیا گیا اور میری توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ خصوصاً

جناب موہن چند مرحوم اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے میری ہمت بڑھائی اور انہی کی حوصلہ افزائی کی بنا پر اپنی دوسری تالیف " مرقع غالب " پیش کر رہا ہوں جس کی ترتیب میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے ۔

۱۔ جن اشعار کی تشریح مرزا صاحب نے اپنے خطوط میں کی ہے، اُن کے حاشیوں میں وہ تحریریں درج کر دی گئی ہیں تاکہ اشعار کا مفہوم شاعر کے نقطۂ نگاہ سے واضح ہو جائے ۔

۲۔ غزلوں کے وہ اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے اُن کا مطلب واقعہ کی تشریح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے

۳۔ مرزا صاحب نے بعض اشعار خطوط میں استعمال کیے ہیں ان ہی اشعار کے تحت خطوط کے حصے بھی شامل کر دیے ہیں تاکہ شعروں سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ انشا پردازی سے بھی حظ اٹھایا جائے ۔

۴۔ قطعات، فردیات کا حال اور کچھ حصہ قادر نامہ کا بھی درج کر دیا ہے جن سے پتہ چل جائے کہ وہ کب اور کس موقع پر کہے گئے تھے ۔

۵۔ تصاویر: بعض تصاویر بھی فراہم کی گئی ہیں، جو مرزا غالب کی جائے پیدائش، مقامات رہائش، دلی، آگرہ، رام پور اور مدفن سے تعلق ہے ۔

۶۔ دلچسپ اشعار: کچھ ایسے اشعار کے مطالب بھی درج کر دیے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے اہم خیال کیے گئے ہیں ۔

۷۔ سوانح حیات: مرزا غالب کی سوانح حیات اُن کے خطوط ہی سے مرتب کی گئی ہے

۸۔ دلچسپ خطوط: سب سے اہم اور دلچسپ غالب کے منتخب خطوط کے عکس ہیں جو انھوں نے اشعار کے ساتھ ساتھ تحریر فرمائے تھے ۔

۹۔ سب سے آخر میں مرزا غالب کے نوشتہ خطوط (عکسی، مندرجہ بالا کے علاوہ دوسرے فراہم شدہ خطوط بھی یکجا درج کر دیے گئے ہیں جن کی نوعیت خاص ہے اور ایک بے بہا مجموعہ ہے ۔

میں اُن ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتائج میرے زیر مطالعہ رہے ہیں اور اُن افسران رضا لائبریری کا عموماً جن کی نوازش سے مجھے خطوط غالب کے عکس حاصل ہوئے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خصوصاً جنھوں نے " مرقع غالب " کی ترتیب میں میری رہنمائی فرمائی، صدق دل سے شکرگزار ہوں ۔

پرتھوی چند ۔

۱۹۶۶ء

تعارُف

غالب ہندوستانی ادبِ عالیہ کے چند اہم اور قابلِ قدر تخلیق کاروں میں شمار ہوتا ہے وہ ہندوستان کی اُس شاعرانہ فکر کا نمائندہ ہے جس میں عجمی روایات کی قلم لگی ہے اور جس کی سادگی و پُرکاری اور بےخودی وہشیاری عالمی ادب کو اظہار اور اسلوب کے بہت سے بیش قیمت اور لائقِ تقلید نمونے دیتی ہے اس لئے غالب کے کلام کو بار بار پیش کر کے ہم عالمی ادب میں بلند ترین ہندوستانی فکرِ شاعرانہ کے مکرر اضافے کا مبارک کام انجام دیتے ہیں۔

برادرِ محترم پرتھوی چندر صاحب کا مرتبہ مُرقعِ غالب بھی اسی سلسلے کی ایک تازہ کڑی ہے۔ جو کتابت، طباعت اور ترتیب کے لحاظ سے خوبصورت تحفہ شمار کئے جانے کی بہر طور مستحق ہے۔

انہوں نے جس عقیدت محبت شیفتگی اور لگن کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے اُس کی داد نہ دینا ادبی دیانت کے خلاف ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اردو دیوان غالب کے ایک اور خوبصورت ایڈیشن کے طور پر خوش ذوق پڑھنے والوں کے ذخیرے میں جگہ پائے گی۔

امتیاز علی عرشی

دیوان غالب کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر سال شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن پرتھوی چند صاحب کا مرتب کیا ہوا دیوان جس نے حُسنِ طباعت کا نیا معیار قائم کیا ہے ایک ایسا مرقع ہے جو صاحبانِ ذوق ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اپنے احباب کی خدمت میں تحفے کی طرح پیش کریں گے۔ دیباچے کے طور پر حیاتِ غالب اور شاعری پر تبصرے کے علاوہ حواشی کے اضافے نے اس کتاب کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اس طرح اشعار کا حُسن نئے لطف کے ساتھ بے نقاب ہوتا ہے۔ خود غالب کے خطوط کے اقتباسات اور عکس تحریر نے صفحات کی آرائش ہی نہیں کی ہے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے احساس وادراک کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔

پرتھوی چندر صاحب کی یہ خوبصورت پیش کش ہزاروں مبارکباد کی مستحق ہے جو بہت سے دلوں میں نیا ذوق پیدا کرے گی۔

سردار جعفری

غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ مرتبہ چھپا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مطبع نظامی، کانپور کے ایڈیشن (۱۸۶۲ء) کو چھوڑ کر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے ہم کسی پہلو سے بھی تسلی بخش کہہ سکیں۔ کتابت کی اغلاط تو شاید ناگزیر ہیں، ان کے علاوہ کاغذ، طباعت، ظاہری شکل و صورت ان میں سے کوئی بات بھی جاذبِ نظر نہیں۔ اسی لئے غالب کو عمر بھر اس کی حسرت رہی کہ کاشکے میرا دیوان ایک مرتبہ تو حسن و اہتمام سے چھپ جاتا!

جو بات ان کی زندگی میں نہیں ہو سکی تھی، وہ ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ پچھلے پچاس برس میں دیوانِ اردو کے متعدد ایسے خوبصورت اور دیدہ زیب اور قیمتی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں کہ اگر کہیں غالب انہیں دیکھ لیتے، تو شادی مرگ ہو جاتے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ دیوان ہے، حُسنِ کتابت، متن کی صحت، عمدہ کاغذ، طباعت کا اعلیٰ معیار غرض ہر پہلو سے یہ ایڈیشن نفسِ کلام اور غالب کے شایانِ شان ہے اور ان سب پر مستزاد اس میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو پہلی مرتبہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں دسیوں جگہ اپنے اشعار کے معانی بیان کئے ہیں۔ بعض اوقات کسی دوست یا شاگرد نے ان سے کسی شعر کی وضاحت چاہی، تو انہوں نے جواب میں اسکے معنی لکھ دیے، یا کبھی کسی اور سلسلے میں انھیں اپنا کوئی شعر یاد آ گیا، تو اس کا ذکر کر دیا۔ مختلف شارحینِ غالب نے اس طرح کے تمام اشارات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان (نسخۂ عرشی) کے حواشی میں ان کا احاطہ کر لیا ہے۔ لالہ پرتھوی چندر نے اس دیوان میں نہ صرف ان مقامات ہی سے استفادہ کیا ہے، بلکہ جا بجا مزید توضیحی حاشیوں کا بھی اضافہ کیا ہے لیکن انھوں نے ایک چیز بالکل پہلی مرتبہ شاملِ دیوان کی ہے یعنی غالب کے اصلی خطوں کے عکس۔ خوش قسمتی سے غالب کے متعدد ایسے خط تاحال محفوظ ہیں جن میں انھوں نے اپنے اشعار کی توضیح و تشریح کی ہے۔ مرتب نے ان خطوں کے عکس متعلقہ مقام پر حاشیے میں دے دیے ہیں۔ اس سے یہ صورت پیدا ہو گئی ہے گویا یہ حواشی خود غالب نے اپنے قلم اور ہاتھ سے لکھے ہوں۔

یقین ہے کہ غالب کے شیدائی اس تحفے کی پوری قدر کریں گے۔ —— مالک رام

نئی دہلی،
یکم فروری ۱۹۶۶ء

پرتھوی چندر مؤلف مرقع غالب

سوانح حیات از مرزا غالب

پیدائش، نام و نسب اور خاندان

نجم الدولہ دبیر الملک۔ نظام جنگ مرزا اسد اللہ بیگ خاں عرف مرزا نوشہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوے لکھتے ہیں:

میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے ۶۹ واں برس شروع ہوا ہے

پھر لکھتے ہیں:

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا، ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا تھا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا، وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا، میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر ہوا ایک ہزار روپیہ ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر ضمن حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کی تھی کہ بمرگِ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ مِلک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔“

مرزا غالب کے والد ماجد عبد اللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی اور یہ خاندان شہر کے عمائدین اور امرا میں شمار ہوتا تھا مرزا غالب

ی والدہ اچھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم مرزا نے ان سے ہی حاصل کی اور بعد میں آگرہ کے مولوی معظم سے۔ یہاں مرزا کو فارسی زبان و ادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا اور حُسنِ اتفاق کہ ملا عبدالصمد جن کا پارسی نام ہرمزد تھا اکبر آباد (آگرہ) میں وارد ہوئے، مرزا کی ان سے ملاقات ہو گئی حالانکہ غالب کی عمر اس وقت ۱۴ سال کی تھی۔ وہ مرزا کی ذکاوت و ذہانت اور لیاقت دیکھ کر حیران رہ گئے جب فارسی ذوق کی بنیاد مولوی معظم نے ڈالی تھی اُس کی تکمیل ملا عبدالصمد نے کی۔ جیسا کہ غالبؔ نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے۔

> "بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبانِ فارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔"

اپنے نانہال کے متعلق شیو نرائن آرام کو یوں لکھتے ہیں

نانہال

میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو، جب یہ جانا کہ تم ناظر منشی بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے، مجھ سے سنو۔ تمہارے ،،، کے والد عہد نجف خاں وہدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کھیتم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ وہ اور میں ہم عمر تھے۔ شاید بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہیں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی چونکہ گھر اُن کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے

جائے وِلادت مرزا غالِبؔ، آگرہ

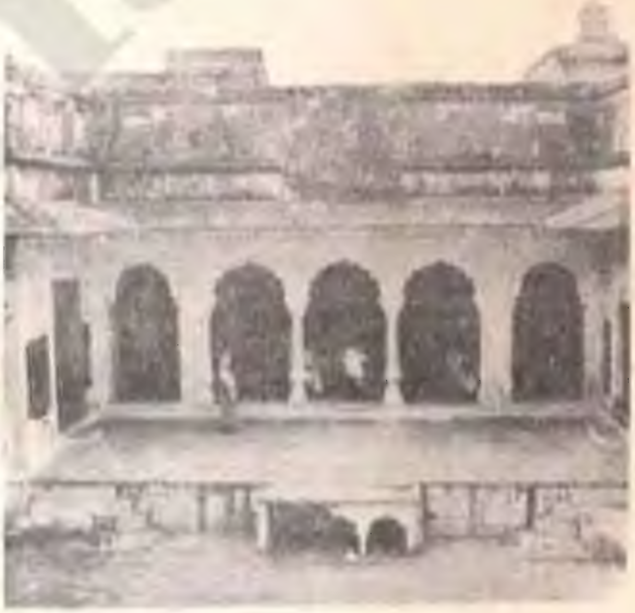

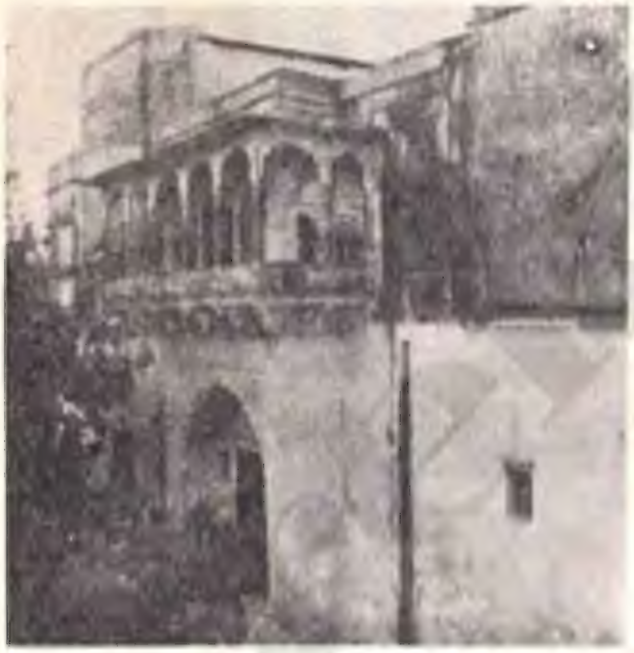

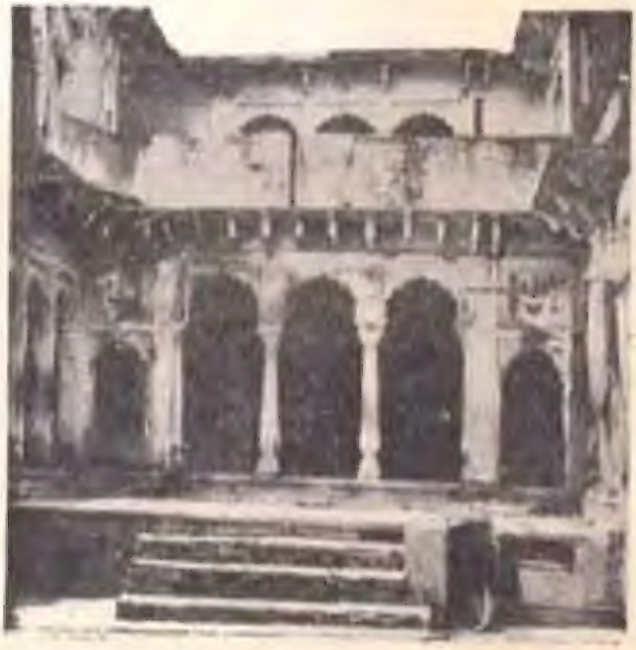

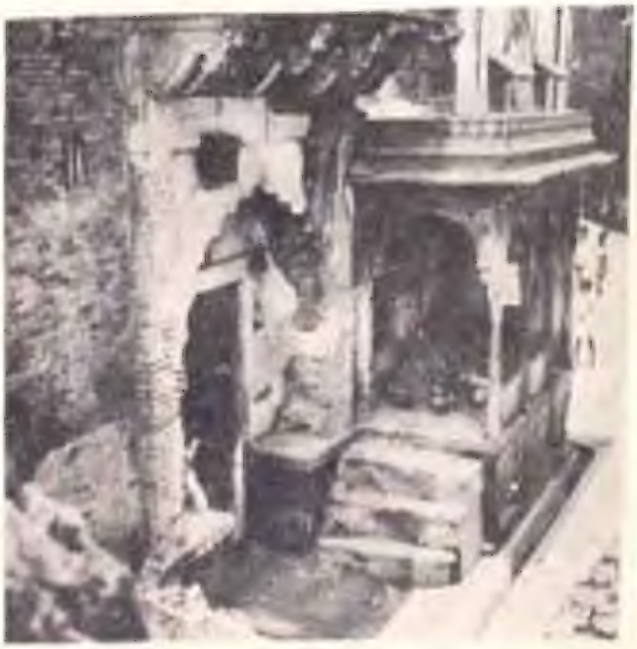

۱۔ ۲۔ کلاں محل ۳۔ ۴۔ کٹڑہ گڈریوں والا۔

Rekhta

جاتے تھے۔ بس ہمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے، کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اُس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیش دست تھا اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اگاہ کر اُن کے پاس جمع کرواتا تھا

شادی اور دلی میں سکونت

مرزا غالب کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش صاحب کی گیارہ سالہ دختر امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اگرچہ ان کا دہلی میں آنا جانا پہلے ہی سے تھا۔ مگر شادی کے بعد انھوں نے مستقل سکونت دلی میں ہی اختیار کرلی۔

شادی کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں :۔

”رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پانوں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔“

حُلیہ

حلیہ کے متعلق حاتم علی مہر کو یوں لکھا۔

بہر حال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری، جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے، عام.

ملّا، حافظ، بساطی، زیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوایا۔

اولاد

سیف الحق کو اُس کے لڑکے کے مرنے پر یوں لکھا: تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتّر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

شاعری کی ابتدا

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں، باسٹھ برس کی عمر ہوئی پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گذرے۔"

"ابتدائے سنِ تمیز سے اردو زبان میں سخن سرائی کی بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی نظم و نثر فارسی کا عاشق ہوں، ایک کم ستّر برس دنیا میں رہا، اب اور کہاں تک رہوں، ایک اُردو کا دیوان، ہزار بارہ سو ابیات، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صِلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی"۔

مرزا غالب کو اپنی پنشن کے متعلق کچھ مغالطہ سا تھا کہ جو مقررہ رقم ان کو ملتی ہے وہ بہت ہی کم ہے اور اس کی چارہ جوئی کے لیے اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کے لیے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر میں مرزا براہِ کانپور، لکھنؤ پہنچے۔ وہاں مرزا کی بہت اچھی طرح خاطر مدارات ہوئی۔ نصیر الدین حیدر والیِ اودھ اور اعتماد الدولہ نائب السلطنت تھے۔ مرزا کی ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ مگر مرزا نے دو شرطیں پیش کیں۔ نائب السلطنت میرا استقبال کریں اور مجھے نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ یہ شرطیں مانی نہ گئیں۔ مرزا غالب لکھنؤ سے روانہ ہو کر بنارس، مرشد آباد ہوتے ہوئے ماہ فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے مگر وہاں ان کے مرافعہ کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ خلعت اور خطاب بحال رہے۔ دورانِ قیام کلکتہ مرزا کو ایک ادبی ہنگامہ پیش آیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہر اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ مرزا غالب کے اعزاز میں بھی ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مرزا نے ایک فارسی غزل پڑھی۔ حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے مرزا کے بعض الفاظ، محاوروں اور ترکیبوں پر اعتراضات کیے اور جواز میں قتیلؔ کے کلام کو

جائے رہائش مرزا غالب، بلیماران دہلی

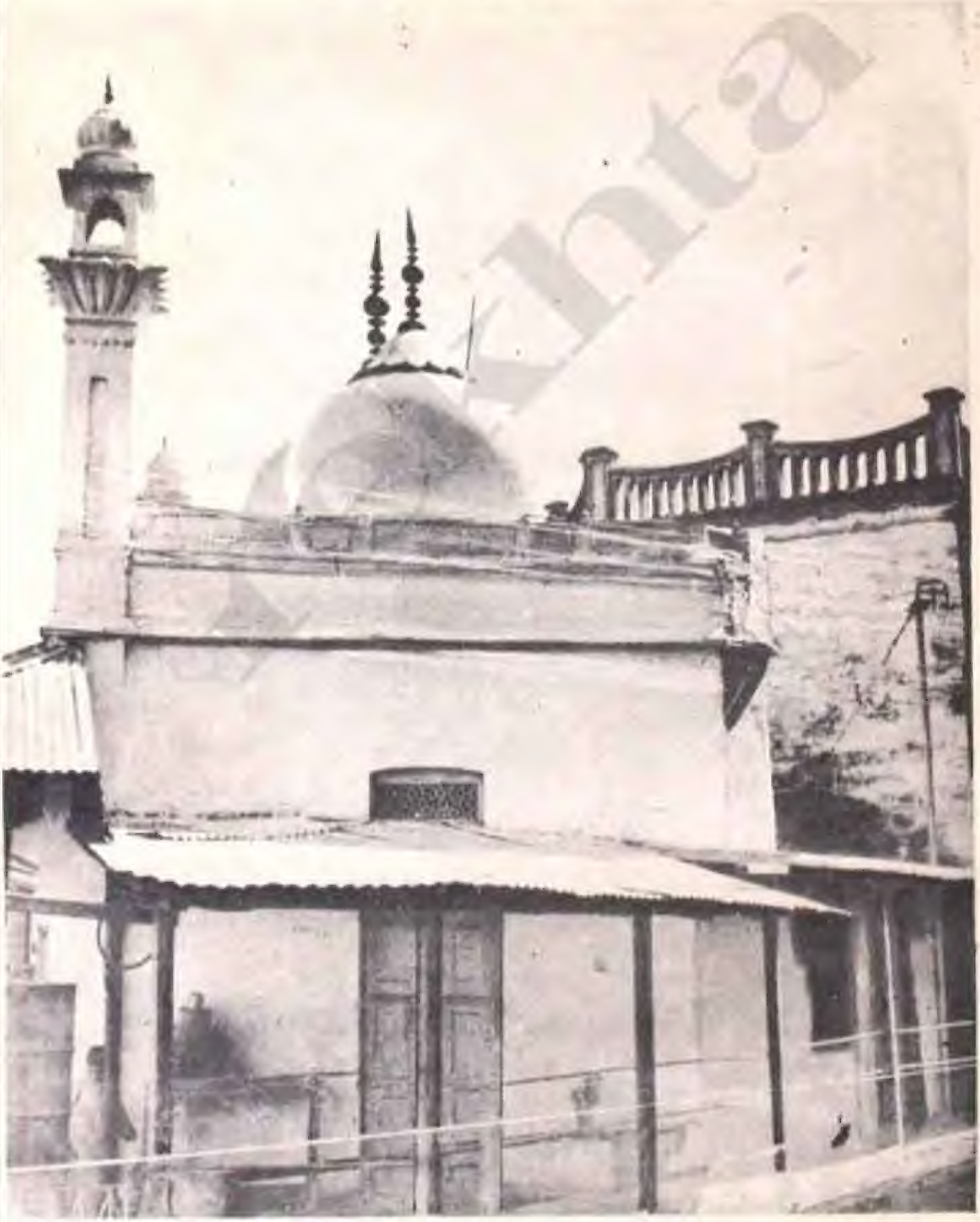

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے

مرزا غالب ہندوستان کے فارسی شعرا میں سے سوائے خسرو کے کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے۔ ناک بھوں چڑھا کر کہا: میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا۔ اس پر زیادہ جوش پھیلا اور مرزا پر اعتراضوں کی بھرمار ہونے لگی۔ مرزا نے مخالفت سے گھبرا کر ایک مثنوی "بادِ مخالف" کے نام سے فارسی میں لکھی کہ میں اس شہر میں انصاف حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے چند روز آرام سے رہنے دیجیے اور مہمان نوازی کا حق ادا کیجیے۔ مجھے کسی سے بھی پرخاش نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا اہلِ زبان کے الفاظ اور محاوروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے لیکن حاسدوں اور مفسدوں نے کوئی بات نہ سُنی اور مرزا کی آخر تک مخالفت کرتے رہے۔ یہاں مرزا کچھ عرصہ رہ کر واپس دہلی چلے گئے۔

حادثۂ اسیری

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی۔ لبا اوقات دوست و احباب بھی ان کے مکان پر آجاتے تھے۔ مرزا غالب تفریحاً کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے مگر چونکہ کوتوال شہر ان کا دشمن تھا اور موقعہ کی گھات میں تھا۔ ایک دن موقع سے مکان پر چھاپا مارا اور دوستوں سمیت کھیلتے ہوئے مرزا کو گرفتار کر لیا۔ مرزا صاحب یوں لکھتے ہیں:-

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکامِ صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزردہ حالی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ خود بخود اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں

تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ، آستانہ رحمۃ اللعالمین، دلداروں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"

مرزا غالب کی عمر ۳۰ برس کی تھی جبکہ انھوں نے دلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کئی مکانات تبدیل کیے۔ کالے میاں کی حویلی، حکیم محمد حسین خاں کی حویلی جیسا کہ لکھتے ہیں: "میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور بلی ماران میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں۔"

دوران برسات یوں لکھتے ہیں۔

مکان اور برسات

دس گیارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیے گیا۔ تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا مکان خالی کر دو، مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی صحن۔ بالا خانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اس طرح گزریں۔ دوشنبہ ۲۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہتر ہے۔

"نہ مجھے خوفِ مرگ نہ دعویٰ صبر ہے، میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ جبر ہے۔ تم نے میاں نجگیری کی بھائی نے برادر پدری کی۔ تم جیتے رہو وہ سلامت رہیں ہم اس حویلی میں تا قیامت رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اس کی دادی بھی گھبرائی مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا درہ یاد تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنانا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنہاری، ان فرقوں کا ممرہ دروازہ رہے گا۔"

قلعہ کی ملازمت

”دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔“

”جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو، دو، شاہ کو دُعا
وہ دِن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔ ”مہرِ نیم ماہ“ نہیں اُس کا نام ”مہرِ نیم روز“ ہے اور سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ ہے، اب وہ بات بھی گئی گذری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل“

غدر کے بعد کے حالات

”پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق ودق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ لاہوری دروازہ کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے اِس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے، تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے“۔

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو:

[۱۲]دلی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

"مسجد جامع واگزاشت ہوگئی چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی کبوتر بکنے لگے عشرہ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے، مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں، تین یہ اور سات اور ـــ ، ر نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال، جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

یہاں شہر ڈھ رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔

"کشمیری کٹرا گر گیا وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔"

لو سنو، ارے تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ وخشت وخاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر کہ شہر صحرا ہوگیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ پَون ٹوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام سدا اللہ کا، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں میں نے دیکھے فارسی عبارت یہ ہے،

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بہ شرطِ ادخال جرمانہ"

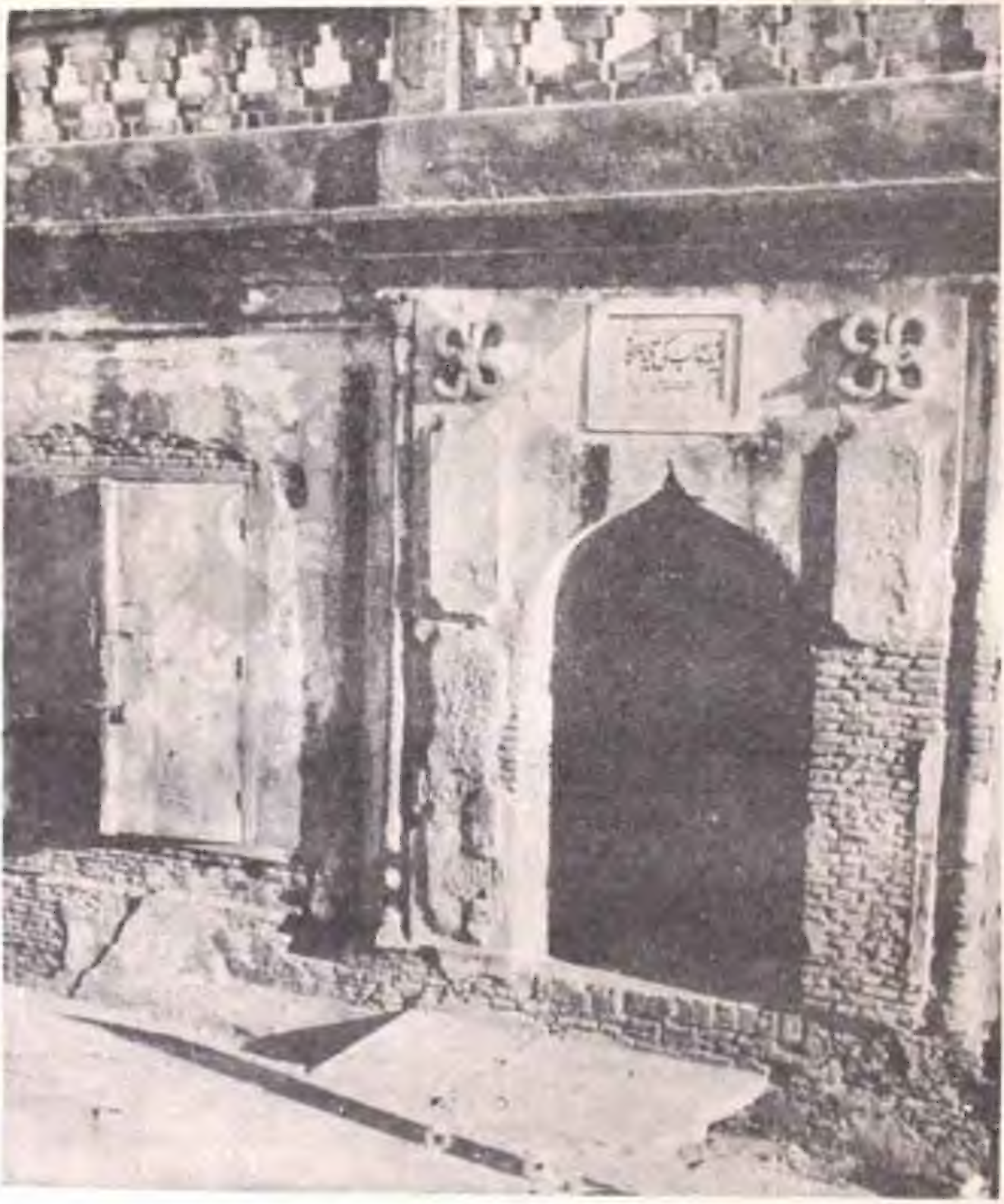

قیام گاہ مرزا غالب محلہ راج دوارہ، رامپور

دربار رام پور سے تعلق

۱۸۵۵ میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے ہیں۔ اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگانی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتحِ دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔

مرزا غالب کے اس خط کا عکس ہے جو انھوں نے اپنی فارسی کتاب 'دستنبو' کے ساتھ نواب یوسف علیخاں کو لکھا تھا

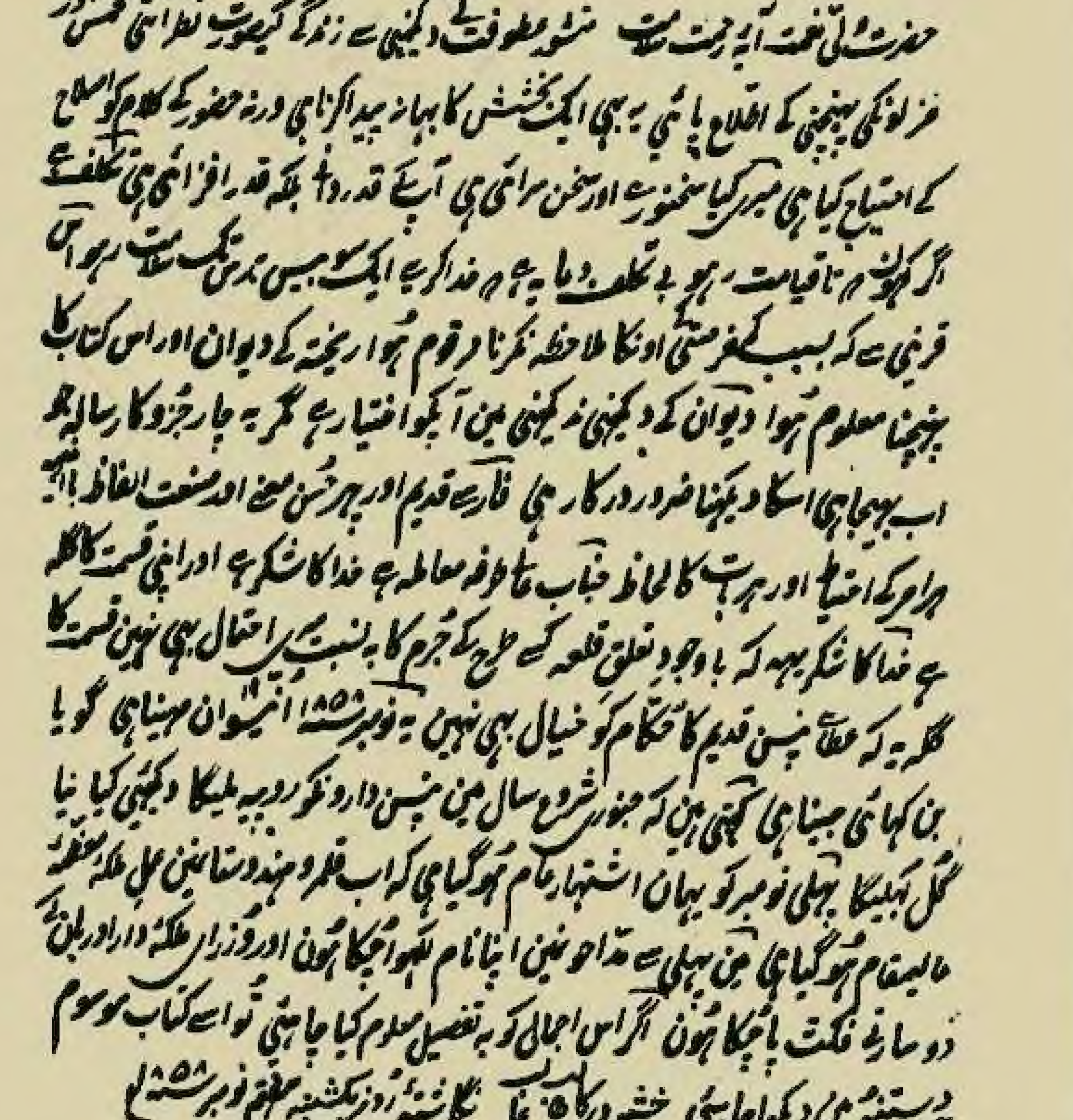

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت   منشور عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مخمس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پایہ افزائی ہے ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح کی احتیاج کیا ہے میری کیا مقدور ہے اور سخن سرائی ہے آپ کے قدردان بلکہ قدر افزائی ہے تکلف ہے اگر کہوں تم تا قیامت رہو بے تکلف دعا یہ ہے خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو آگے قرین ہے کہ بسبب کثرت مشغلہ اونکا ملاحظہ نہ کرنا مرقوم ہوا ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپکو اختیار ہے مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو اب بھیجا ہے اسکا دیکھنا ضرور درکار ہے فارسی قدیم اور پھر حسن معنے اور صنعت الفاظ با اینہمہ برابر کے احتیاط اور ہر بات کا لحاظ جناب عاطفت معاملہ ہے خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے خدا کا شکر یہ ہے کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں قسمت کا گلہ یہ کہ علاقہ پنشن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں یہ نومبر ۱۸۵۸ء انیسواں مہینا ہے گویا جو کہا ہے جینا ہے کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشن داروں کو روپیہ ملیگا دیکھئے کیا نیا گل کھلیگا پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکہ معظمہ کا علی العموم ہو گیا ہے میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزراے ملکہ دار اور ملک کے دو [illegible] پا چکا ہوں اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسے کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے   خشنودی کا طالب غالب   نگاشتہ روز یکشنبہ ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء

۴ نواب یوسف علی خاں والی رامپور بڑے اشتیاق و احترام سے مرزا غالب کو تشریف لانے کے لیے لکھتے ہیں۔

"مشفقا! چونکہ مخلص اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجہ کمال ہے اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے۔ اس واسطے حوالہ خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے۔"
۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء

دوسری بار یوں تحریر فرماتے ہیں: "حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا اور دل صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافت مسرور ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامہ اتحاد نگار کے ہوتا ہے آپ براہِ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس مدت سے کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمایئے۔"

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت — جواب میں مرزا غالب کا خود نوشتہ خط ملاحظہ فرمایئے۔

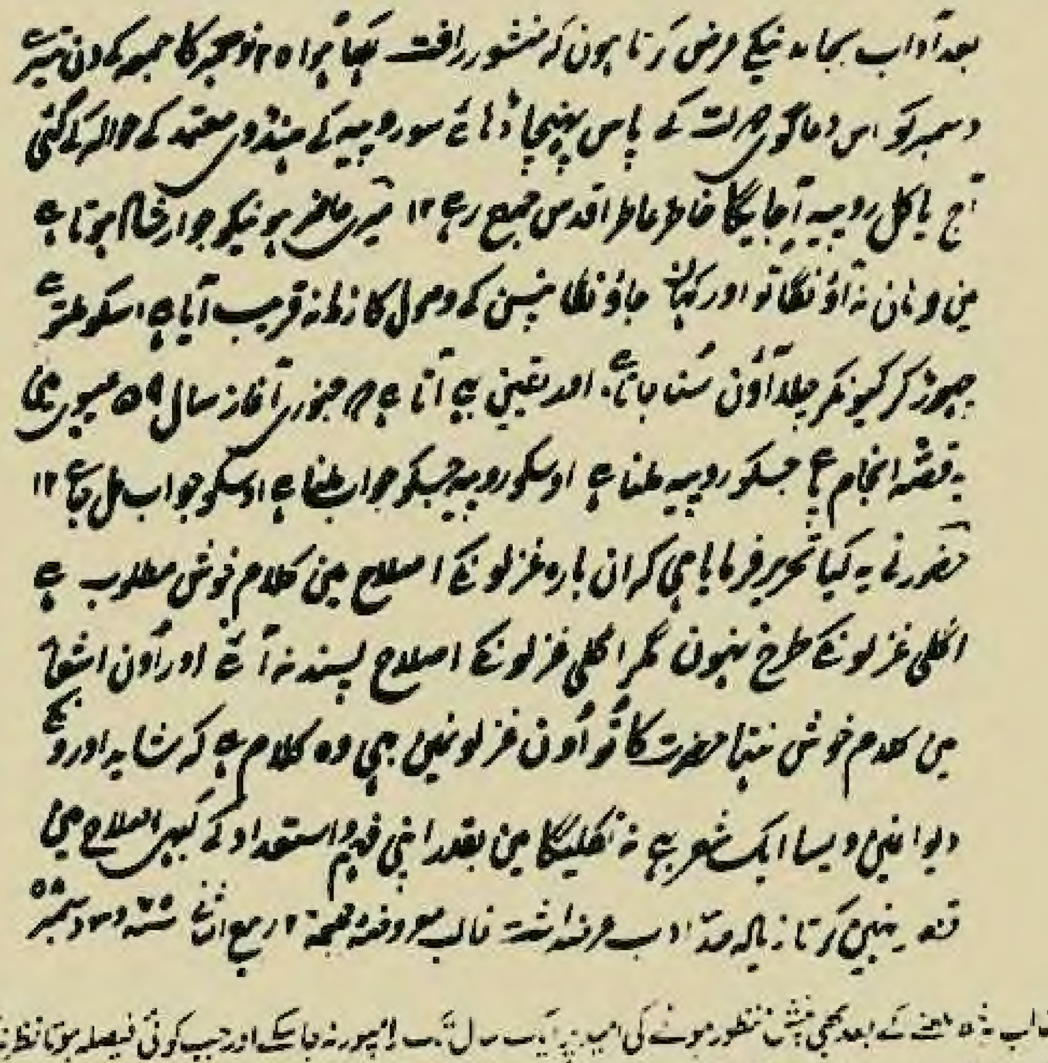

بعد آداب بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشور رافت بھیجا ہوا ۲۰ نومبر کا جمعہ کے دن تیسری
دسمبر کو اس دعا گو حضرت کے پاس پہنچا۔ دو سو روپیہ کی ہنڈوی معتمد کے حوالہ کی گئی
آج یا کل روپیہ آ جاویگا خاطر عاطر اقدس جمع رہے۔ میرا حاضر ہونیکو جو ارشاد ہوتا ہے
میں وہاں نہ آؤنگا تو اور کہاں جاؤنگا خصوص کہ وصول کا زمانہ قریب آیا ہے اسکو چھوڑ
چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں سنا جاتا ہے۔ اور یقین ہے آتا ہے ۱۷ جنوری آغاز سال ۶۰ میں یہ
قصہ انجام پاوے جسکو روپیہ ملنا ہے اوسکو روپیہ جسکو جواب ملنا ہے اوسکو جواب مل جاوے۔
حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے
اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی اور ان اشعار
میں کلام خوش نہ تھا حضرت کا گو ان غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ رشک [illegible] اور دو
دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلیگا میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں
قصور نہیں کرتا۔ نیاز نامہ ادب عرض نامہ غالب مرقومہ جمعہ ۲ ربیع الثانی سنہ ۷۶ و ۳ دسمبر

۱۔ غالب خط لکھنے کے بعد بھی پنشن منظور ہونے کی امید پر ایک سال تک رامپور نہ جا سکے اور جب کوئی فیصلہ ہوتا نظر نہ آیا تو دلی سے مرادنگر، میرٹھ، شاہجہانپور، گڑھ مکتیسر، مرادآباد ہوتے ہوئے جنوری سنہ ۶۰ء کو رامپور پہنچے۔ نواب صاحب نے بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی خاص کوٹھی میں رہائش کا انتظام کیا مگر چند یوم بعد [illegible] ایک [illegible] مکان میں تاقیام رامپور وہیں رہے۔

مزار مرزا غالب، قرب نظام الدین اولیاء دہلی

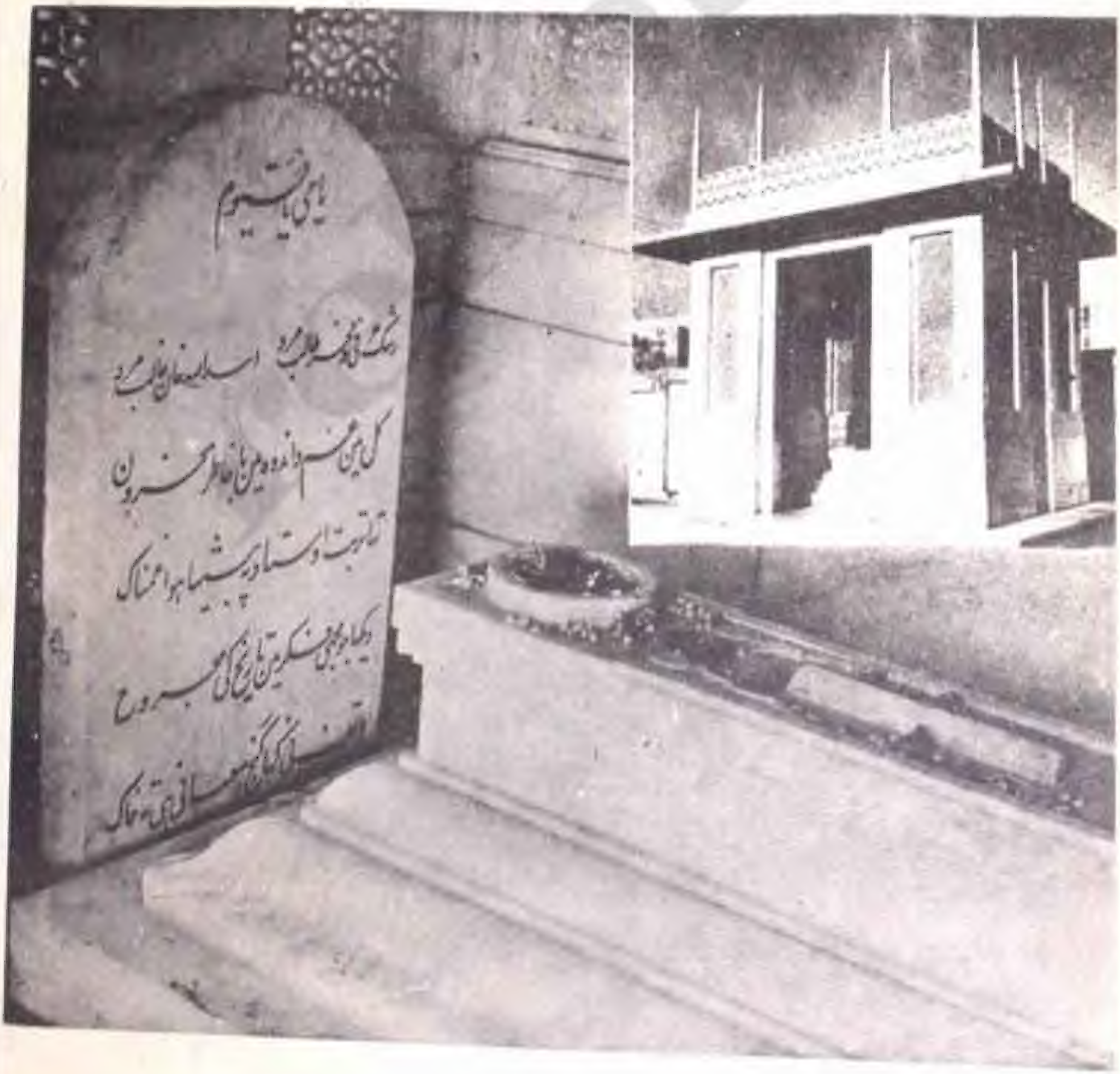
یا حی یا قیوم
رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزون
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

آخری ایام ناتوانی زوروں پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے ہاویہ زاویہ ہے، دوزخِ جاوید اور ہم ہیں۔

اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے۔

آپ کی پرسش کے قربان جاؤں جب تک میرا مرنا نہ سُنا میری خبر نہ لی

میرے محب! میرے محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں، آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا جاتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا وہ آورد ہے، رعشہ، ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

بقول حالی، وفات سے ایک دن قبل نواب علائی کو خط میں لکھوایا "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں سے پوچھنا۔" اُن دنوں میں یہ شعر مرزا صاحب عموماً پڑھتے رہتے تھے ؎

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے   دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے

بیہوشی کے عالم میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے تمام کوششیں اور علاج بے سود ثابت ہوے۔ آخر کار وہ دن آگیا جس کا غالب کو ایک مدت سے انتظار تھا اور ۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء بروز شنبہ دوپہر ڈھلے شاعری کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا یہ افسوسناک خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور زیارت کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

تجہیز و تکفین کا انتظام نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کیا۔ شہر کے تمام اکابر و عمائد جنازے میں شریک ہوے، دہلی دروازہ کے باہر نماز ادا کی گئی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پہلو میں دفن ہوے۔

تبصرہ

پتہ نہیں اس کارگاہِ عالم میں پیدائش و موت کا عمل کب سے جاری ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہیگا ہر طلوعِ صبح کے ساتھ نہ جانے کتنے جامہ ہستی سے آراستہ ہو کر سطحِ ارض پر قدم رکھتے ہیں اور کتنے تارِ ہستی کو شکستہ کر کے آغوشِ فنا میں جا چھپتے ہیں۔ یہ عمل ہر لمحہ برسرِ کار ہے۔ پیدا ہونے والوں میں ہر قسم کے لوگ اِس دنیا میں آکر اپنے افکار و اعمال کے ڈنکے بجا کر چلتے بنتے ہیں مگر ان کی دکھائی ہوئی شاہراہیں اربابِ دُنیا کے لیے غور و فکر کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسی ابدی اور یکتائے زمانہ ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کا ظہور صدیوں بعد ہوتا ہے اور جب ایسی ہستیاں ابھرتی ہیں تو علم و ادب کی نئی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی ایسے ہی نادرہ کار فن کاروں میں یگانہ و یکتا تھے جن کی رفعتِ تخیل، جدتِ ادا اور حُسنِ بیان نے شعر و ادب کو ایسی حیات بخشی جس کی آب و تاب کے سامنے مرزا غالب کے ہمعصر تاب نہ لا سکے۔ یوں تو شعر و ادب کے افق پر بے شمار ستارے اُبھرے اور اُبھرتے رہتے ہیں مگر ان میں وہ روشنی کہاں جو غالب میں ہے کیونکہ جہاں غالب کی فکری پرواز پہنچتی ہے وہاں دوسرے شعرا کا گزر بھی نہیں ہوتا

مرزا غالب کا ابتدائی کلام الفاظ و معانی میں مشکل اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس پر معاصرینِ غالب نے اکثر ہنگامے برپا کیے، مگر مابعد ان کی نکتہ رس طبیعت نے کلام میں سادگی اور پرکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ جن کی روشنی رہتی دنیا تک قایم رہے گی۔

مرزا غالب ہی پہلا شاعر ہے جس نے اُردو غزل کو نئے نئے مضامین سے بھر دیا اور فلسفہ و حکمت کا رنگ دے کر گہرائی اور گیرائی بخشی۔ ورنہ غالب کے عہد تک غزل گوئی برابر ایک ہی روش پر چلی آرہی تھی، وہی فرسودہ محاورے، سیدھا سادا روزمرہ، مقررہ تشبیہات و استعارات، ہجر و وصال کے پامال جذباتِ حسن و عشق وغیرہ۔ چونکہ مرزا غالب فطرتاً ایک شوخ اور ندرت پسند طبیعت لے کر آئے تھے اس لیے ان کو یہ داستان گوئی اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ وہ شعر و سخن کے میدان میں ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوئے۔ انھوں نے غزل کو

نیا لب و لہجہ اور نئے اندازِ بیان سے آراستہ کیا۔

غالب کی کتابِ شاعری میں بے شمار جلی عنوانات ہیں۔ طنز و ظرافت کو دیکھا جائے تو زعفران زار نظر آتا ہے۔ گہرائیِ افکار کا مشاہدہ کیا جائے تو لاشال ہے۔ طرزِ ادا اور ندرتِ بیان پر روشنی ڈالی جائے تو ایک جہانِ نو کی سیر کا لطف حاصل ہوتا ہے

مرزا صاحب بحیثیت نثر نگار

مرزا کی شاعرانہ عظمت میں تو گنجائشِ کلام نہیں مگر اُن کی نثر نگاری کا مرتبہ بھی ان کی شاعری سے کم بلند نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جن میں گوناگوں کمالات و صلاحیتیں یکجا پائی جاتی ہوں۔ اگر کسی میں ملکۂ شاعری پایا جاتا ہے تو کسی کو نثر میں موتی بکھیرنا آتا ہے۔ کسی کا قلم جاندار ہے تو کسی کی زبان تیغ جوہر دار ہے۔ مگر یہ غالب کی ہستی ہے کہ جہاں کمالات برابر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ یعنی اگر وہ ایک طرف عظیم شاعر ہیں تو دوسری طرف اعلیٰ پایہ کے نثر نگار اور انشا پرداز بھی ہیں۔

مرزا صاحب کی نثری تصانیف میں خطوط کا سرمایہ گراں بار ہے اور گراں قدر بھی۔ یہ خطوط اگر ایک نوعیت سے مرزا کی اندرونی اور بیرونی زندگی کے ترجمان ہیں تو دوسری حیثیت سے ان کی شوخیِ تحریر اور پاکیزگیِ بیان کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنھوں نے ایک البم کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ پر کشش بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

مرزا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ہستی کو خطوط کے آئینہ میں پیش کیا ہے۔ روزمرہ کی باتیں ایسے انوکھے اور شگفتہ انداز سے قلم بند کی ہیں کہ عبارت کی دلچسپی اور طرزِ بیان کی خوبی میں چار چاند لگ گئے ہیں یہ خطوط تمام کے تمام فطری اور بے تکلف ہیں۔ ان میں نمائش اور ظاہر داری کا پتہ نہیں۔ اپنے کلام پر ناز بھی کرتے ہیں اور قسمت کا گلہ بھی۔ وہ دنیا کے اچھے خاصے شعور کے باوجود بھی دنیادار اور زمانہ ساز نہیں ہیں۔

غالب خطوط میں مکتوب الیہ کی حیثیت کے اعتبار سے ایسے جملے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ جن سے ہر جگہ ایک امتیازی شان ٹپکتی ہے۔ عبارت کی سلاست و روانی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ ظرافت سے بھرپور جملے، چھوٹے چھوٹے چٹکلے، لطیف شوخیاں، نرالی ادائیں، کچھ عجیب لطف اور دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ غالب نے لمبے چوڑے القاب یک قلم ترک کر دیے وہ کبھی کبھی تو بغیر ہی

القاب کے نفسِ مضمون پر اُتر آتے ہیں۔ غالب کی شوخیاں اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ اپنے گھر والوں سے بھی اسی انداز سے مخاطب ہوجاتے ہیں ۔

جو حضرات مرزا غالب کا موازنہ ان کے ہمعصروں سے کرتے ہیں وہ کوئی قابلِ تعریف ادبی خدمت انجام نہیں دیتے بلکہ معیارِ ادب ہی کو گھٹا دیتے ہیں. کیونکہ مقابلہ کرنے میں کلامِ غالب کی آب و تاب کے سامنے ان کے معاصرین کے کلام کی خوبیاں اور اوصاف مزید بدہضم پڑ جاتے ہیں۔ لوگ موازنہ کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب کے ادب کی تخلیق ایک قدرتی عطیہ ہے جبکہ دوسرے شعراء کا کلام محنت و کوشش کی پیداوار ہے. بالعموم ایسا ادب جدت و ندرت سے محروم ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کے آس پاس روایت و تقلید کے پردے پڑے ہوتے ہیں برخلاف اس کے غالب کا فن سرتاسر ایک نئے فہم کی دولت سے مالامال ہے جو ان کے اپنے ذہن و فکر کی تخلیق (جدت) ہے. یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تقلید و پیروی کے بجائے انوکھا پن ہے اور نرالا ڈھنگ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ ستاروں کی روشنی، ماہتاب کی روشنی، سورج کی روشنی، ہر ایک اپنی اپنی جگہ روشنی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان روشنیوں کا مقابلہ کرنے لگے تو اسے کیا کہا جائے گا. حالانکہ ستارے، چاند اور سورج سب ہی روشن ہیں مگر ان میں جو فرق ہے وہ ہر باشعور کو معلوم ہے. بس یہی فرق کلامِ غالب اور ان کے ہمعصروں کے کلام میں ہے ۔ بے شک و شبہ کہنا پڑتا ہے کہ: " غالب کا ہے اندازِ بیاں اور "

مرزا نے حالات کی ناسازگاری سے متاثر ہو کر انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دردِ دل اور خونِ تمنا کا اظہار کتنے مایوسانہ انداز میں کیا ہے "میں زمانے سے زیادہ نہیں تھوڑی سی آسائش اور اطمینانِ قلب چاہتا تھا جو مجھے نہ مل سکا۔" ان تمام حرماں نصیبوں کے باوجود انہوں نے جو کچھ بھی کہا اور جس عالم میں کہا اس کی قیمت اور بلندی کا ان کو احساس تھا چنانچہ مہرِ نیمروز میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" صاحبقرانِ ثانی حضرت شاہجہاں نے اپنے درباری شاعر کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تلوایا تھا میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو آپ سخن سنج حضرات کو حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام کو ہی کلیم کے کلام کے ساتھ تولنے کی زحمت گوارا فرمالیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ لوگوں نے مرزا صاحب کے مرتبے اور مقام کا ان کی زندگی میں صحیح اندازہ نہیں لگایا۔

دنیا نے کم فہمی اور نا سمجھی کے سبب ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔

"درفشِ کاویانی" میں مرزا صاحب نے اپنے اعلیٰ مقام کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

"روحِ سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس گزر چکے اور اب میری عمر چھیاسٹھ کی ہو چکی ہے۔ میں اس نعمتِ کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکرگزار ہوں کہ کمالاتِ فن سے نوازنے والے مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے کھول دیے ہیں اور میرے فکر و خیال کی کرسی کو معرفت و آگاہی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دَور کے لوگوں نے میری شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہچانا۔ ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کو روشنی بخشنے والے کمالات کہ جن کو میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ لوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے۔

(ترجمہ فارسی)

شاگرد کو ایک خط میں لکھا "نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

پھر ایک خط میں نواب علاؤالدین احمد کو لکھا۔ "مجھے اپنے ایمان کی قسم ہیں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا"

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کے کلام اور ادب کی جو قدر ہوئی یا دنیا نے اس کی جو قیمت لگائی اس کی مثال اس پیرزال کی سی ہے جو سوت کی انٹی لے کر بازار مصر میں حضرت یوسف کی خریداری کے لیے پہنچی تھی۔ بقولِ غالب ؎

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت   میں یوسف بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

یوں تو مرزا غالب کے کلام میں بے شمار قسم کے مضامین و خیالات موجود ہیں جو غزل گوئی کے دائرہ میں شامل ہیں۔ یہاں کچھ عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ہر شعر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ لطفِ زبان اور حسنِ بیان کی وہ کونسی خوبی ہے جو ان شعروں میں موجود نہیں۔ یقیناً ایسے ہی اشعار ہوتے ہیں جو خود بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور شاعر کو بھی زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔

عاشقانہ
نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب   کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا   تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ   جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا!   پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب   دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

خمریات، شوخی
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید   مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ   مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے   مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم   دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار   یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

رقابت
اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل   میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے   ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

پاسباں	دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے	بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
	گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے	اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
	بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے	کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
شبِ غم	کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے	مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
	کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
	کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
اَخلاق	دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا	یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
	نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی	نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
	روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی
	سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب	خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے
یادِ رفتگاں	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
	مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم	تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟
ناصح	شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا	آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
	حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ	کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟
	یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح	کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
	گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی	یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟
	نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی	ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
موت	ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی	میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
	تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
	رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
	یہ ضد، کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے	قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے؟
سوز و گداز	ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا	نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
	نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ	رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
	نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے	بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی

تصوف

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں　　حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

دُشمنی

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو　　دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو　　کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم　　آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
دشمنی نے میری کھویا غیر کو　　کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

شکایت

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ　　تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ　　بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

متفرق اشعار

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال　　کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　جانا کہ اِک بزرگ ہیں ہم سفر ملے

جور سے باز آئے، پہ باز آئیں کیا   کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا   جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول   آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو   آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ   ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب   یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   ترا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی   روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا   تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے   دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر   وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مرزا غالبؔ عجیب و غریب دماغ لے کر آئے تھے۔ ان کو اپنی صلاحیتوں کا پورا احساس تھا۔ زمانہ کی بے حسی و کم نگاہی پر ان کا دل جلتا تھا مگر خود اعتمادی میں کسی طرح کمی نہ آنے پائی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے راستہ بھی الگ اختیار کیا۔ نادر تشبیہیں اور خوبصورت استعارے تلاش کیے۔ تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی سے گلستانِ شاعری کو یوں آراستہ کیا کہ شعر و ادب کو چار چاند لگ گئے۔ قدرت نے یہ عطیہ غالبؔ ہی کو بخشا تھا جو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اگرچہ متعدد شاعروں نے مرزا غالبؔ کے رنگ کو اپنانا چاہا اور ہر زاویہ سے دوڑ دھوپ کی مگر گردِ راہ کو نہ پہنچ سکے۔ گویا

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے   تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کلیاتِ نثرِ فارسی

سبدِ چین ، دُرفشِ کاویانی ، دستنبو ،
پنج آہنگ ، قاطع برہان ، مہرِ نیمروز ،
دعاء صباح ، مآثرِ غالب ،

کُلیاتِ نظمِ فارسی

غزلیات ، رباعیات ، قطعات اور مثنویات کا مجموعہ ہے مثنوی ابرِ گہربار اور درد وداغ شاہکار مثنوی ہیں

نثرِ اردو

عُودِ ہندی ، اردوے معلّٰے ، مکاتیب غالب مرتبہ عرشی خطوط کے مجموعے ہیں۔ نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب

دیوانِ غالب اُردو

یہ وہی منتخب دیوان ہے کہ جو مرزا کی حیات میں پانچ مرتبہ شائع ہوا یعنی ۱۸۴۱ و ۱۸۴۷ و ۱۸۶۱ دہلی میں ۱۸۶۲ کانپور میں اور ۱۸۶۳ آگرہ میں چھپا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور یہ کلام ہی ہے جس سے مرزا زندہ جاوید ہیں

شجرہ مرزا غالب

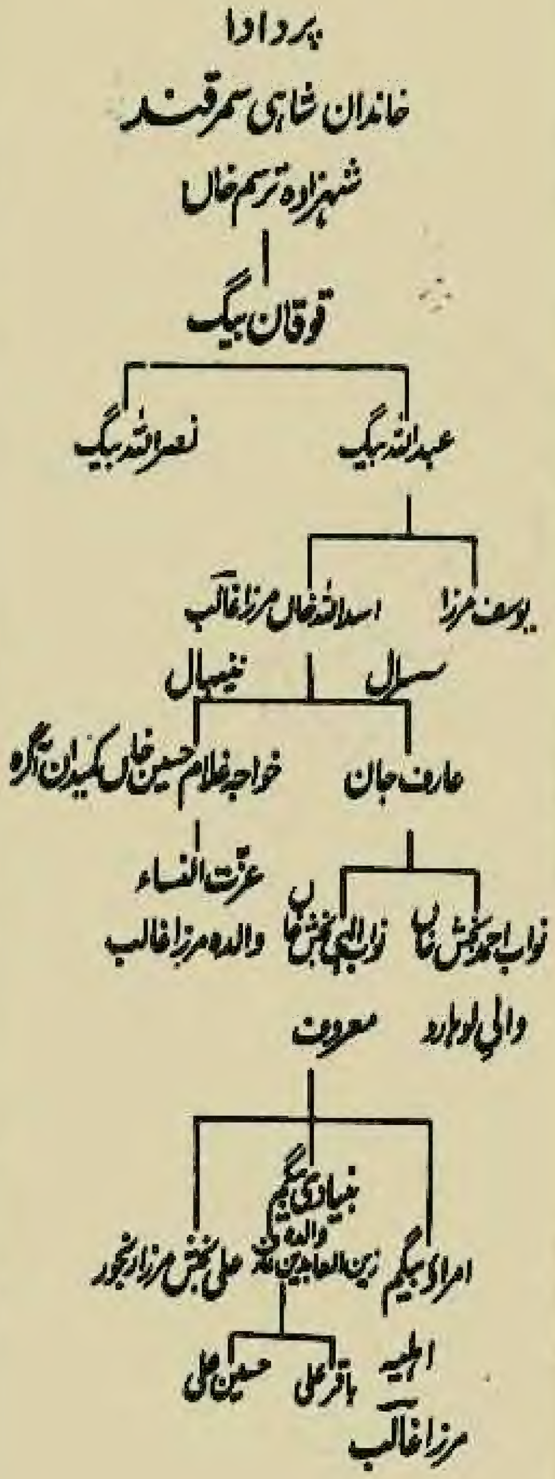
پردادا
خاندان شاہی سمرقند
شہزادہ ترسم خاں
قوقان بیگ
عبداللہ بیگ
نصراللہ بیگ
یوسف مرزا
اسداللہ خاں مرزا غالب
سسرال
ننھیال
عارف جان
خواجہ غلام حسین خاں کمیدان آگرہ
نواب احمد بخش خاں
والیِ لوہارو
نواب الٰہی بخش خاں
معروف
عزت النساء
والدہ مرزا غالب
بنیادی بیگم
والدہ
زین العابدین خاں
امراؤ بیگم
اہلیہ
مرزا غالب
علی بخش مرزا رنجور
باقر علی
حسین علی

الف

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (۱) کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ (۲) صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا مُوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ، الماس ارمغان، داغِ جگر ہدیہ (۹) مبارکباد اسد، غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(۱) اس شعر کو بعض شارحین نے بے معنی قرار دیا ہے جو کہ سراسر بے انصافی ہے جبکہ اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب نے عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے کہ "ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اُس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو موجبِ رنج و ملال و آزار ہے۔"

(۲) جُوئے شیر دودھ کی نہر۔ شیریں کے عاشق فرہاد نے کوہِ بے ستون کو عرصہ دراز کی محنت سے کاٹ کر نہر کو نکالا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کا ہمراز شاپور اپنے دوست فرہاد کو شیریں کے پاس لایا۔ فرہاد شیریں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اس کے عشق کا چرچا پھیلا تو خسرو کو بھی پتہ چل گیا۔ اس نے سزا کے طور پر فرہاد سے کہا کہ شیریں کو تازہ دودھ ملنے میں دِقت ہے اگر کوہِ بے ستون کاٹ کر اُس کے لیے دودھ کی نہر محل کے نیچے لائے تو شیریں کو پا سکتا ہے۔ خُسرو کو یقین کامل تھا کہ یہ محال کام فرہاد سے نہ ہو سکے گا اور ایفائے وعدہ کا موقع کبھی نہ آئے گا۔ مگر عاشقِ زار ایسا مصروف ہوا کہ برسہا برس کی مشقت سے ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیا۔ جب وعدہ کا موقع آیا تو خُسرو نے ایک مکار بڑھیا کے ذریعہ جھوٹی خبر اُڑا دی کہ شیریں مر گئی ہے جس کو سُنتے ہی فرہاد نے اپنے تیشے سے سر پھوڑ کر خود کو مار ڈالا۔ فرماتے ہیں:
ہجر کی رات کاٹنی اتنی مشکل ہے جتنی فرہاد کو نہر کے لانے میں ہوئی تھی۔

(۹) جراحت، زخم۔ الماس، ہیرا جس کے چاٹنے سے آدمی مجروح ہو جاتا ہے اور جس کا سفوف زخم پر چھڑکنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ارمغان، تحفہ۔ اسد، غالب کا پہلا تخلص۔ اے اسد مبارک ہو کہ تمہاری دردمند جان کا ہمدردِ عشق اس شان کے ساتھ تم سے ملنے آیا ہے کہ جگر کے داغ اور الماس جیسے تحفے اپنے ہمراہ لایا ہے۔

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار   صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سُویدا کیا دُرست   ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے مُعاملہ   جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بُود" تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی   مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ (۹)   سرگشتۂ خُمارِ رُسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا   دل کہاں، کہ گُم کیجے؟ ہم نے مُدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم   آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہُشیاری   حُسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل   خُوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی   ہم نے بارہا ڈھونڈا تُم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا   آپ سے کوئی پوچھے تُم نے کیا مزا پایا؟

---

(۹) کوہکن کا عشق کامل نہ تھا ورنہ شیریں کی موت کا علم ہوتے ہی اُس کی جان نکل جاتی لیکن اُس نے اپنے مرنے کے لیے تیشے کا استعمال کیا۔ ایک عاشق کی یہ شان ہے کہ مرنے کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج نہ رہے۔

مرزا صاحب کوہکن کی موت پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ عشقِ کامل کا درجہ بہت بلند ہے کوہکن وہاں تک نہ پہنچ سکا رُسوم و قیُود نے اُسے مرنے کے لیے تیشہ کا محتاج بنا دیا۔ عشقِ کامل ان پابندیوں سے ہمیشہ آزاد ہے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے، جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا (۱)
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب! (۲)
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا
بُوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی نوآموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

(۱) اس شعر کا مطلب مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے۔
"رقیب بمعنی مخالف۔ شوقِ سروساماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر با تنِ عریاں ہی کھنچتی ہے جہاں کھنچی ہے۔"

(۲) اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے شاکر کو لکھا ہے۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔
'نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں ÷ وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے' یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پرافشاں یعنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے مناسبِ حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگیِ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سرپٹ نکل گیا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا (۱) عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے (۷) حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا (۸) تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
بفیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(۱) فرہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے صرف عشق کی دھمکی میں آکر ہی اس کی طرح جان نہیں دی، بلکہ ہم تو مردانگی کے ساتھ عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

(۷) اسدؔ خستہ جان کو خدا بخشے عجیب آزاد مرد تھا۔ لاش کے لیے بھی پابندِ کفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنی آزادی مر کر بھی برقرار رکھی۔

حضرت ذوقؔ نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(۸) یہ مطلع اور اس کے بعد کے دو شعر مرزا صاحب کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہیں، ابتدائی کلام میں مرزا صاحب کے یہاں بیان کی پیچیدگی اور فارسیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ فرماتے ہیں ہمارے محبوب کو ایک ہی ہاتھ سے سو سو دل اُڑا لینے کا شغل پسند ہے اس لیے اس مشکل پسند محبوب کو تسبیح کے دانوں کو شمار کرنے کا شغل پسند ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا (۲) — یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ (۳) — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا! — کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو — لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے — کرے جو پرتوِ خورشید عالمِ شبنمستاں کا

(۲) مرزا صاحب نے سانپ اور زمرد کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے: "قبولِ دعا وقت طلوع منجملہ مضامینِ شعری ہے جیسے کتاں کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔
دمِ افعی، سانپ کی پھنکار۔ زمرد، سبز رنگ کا قیمتی پتھر جس کے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ آصف الدولہ والی اودھ نے اسکا تجربہ کیا، سانپ کے سامنے زمرد رکھا لیکن سانپ اندھا نہ ہوا، مرزا صاحب نے اسکی تائید میں سبزۂ خط کو زمرد اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دیکر یہ مضمون پیدا کیا۔"

(۳) دمِ عیسیٰ، عیسیٰ کی پھونک۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک زبردست پیغمبر گزرے ہیں ان کے ماننے والوں کو عیسائی کہتے ہیں مسلمان بھی ان کو پیغمبر مانتے ہیں، ان کا یہ معجزہ تھا کہ اپنی پھونک سے مردہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔
فرماتے ہیں مسیحا نے مجھے حیات دینے کے لیے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبشِ لب بھی گراں گزری اور یہ صدمہ میں برداشت نہ کر سکا۔ جو جنبشِ لب زندگی بخشنے والی تھی میرے لیے موت کا باعث بن گئی۔

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیُولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا!
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بُوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سُوئے غیر نظرہائے تیز تیز!
مَیں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ مَیں
طُعمہ ہوں ایک ہی نَفَسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اِس گرہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گُہر ہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا (۱) رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا (۲) اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؛ آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
اُسکی اُمت میں ہوں مَیں میرے رہیں کیوں کام بند؟ (۱۰) واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

(۱) ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کی زیرِ سرپرستی قلعہ معلّی میں ہوا کرتے تھے اور جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ (۲) دوسرے شعر میں مشاعرہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکدہ کے حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

(۱۰) مقطع میں مرزا صاحب نے شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں اُن کی اُمت میں ہوں جن کے لیے عرش پر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے۔ پھر میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔ معراج اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دیگر انبیا سے اُن کا درجہ بلند کرنے کے لیے عرش پر بلایا تھا۔ رسول اللہؐ صلعم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جُو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کم خواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا (۶)
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے!
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں؟
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

(۶) سپند، اسپند۔ کالا دانہ جس کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے آگ میں جلاتے ہیں۔ رات کو ہمارے دل کے نالے میں بالکل اثر نہ تھا۔ اگرچہ وہ جلتے ہوئے اسپند کے مانند بے چین ضرور تھا لیکن ہمیں بچانے کے بجائے وہ محبوب اور غیر کی ملاقات کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے اسپند بن گیا تھا۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تُو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ (۹)
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ (۱۲)
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۹) مرزا صاحب کو ایک دفعہ زنداں میں بھی جانا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔ حیف اِس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱۲) وحشت خرامی، دیوانہ وار گھومنا، صحرا گرد، جنگل ہی میں گھومنے والا، خانۂ بے دروازہ، بغیر دروازہ کا مکان
دیوانگیِ عشق کی وجہ سے مجنوں ہمیشہ جنگل میں گھومتا رہتا تھا۔ یہی اُس کا گھر در تھا۔ اگر لیلیٰ بھی مجنوں کے عشق میں گھومتی ہوئی اُدھر جا نکلتی تو اُسے مجنوں سے ملنے میں کوئی دقت نہ ہوتی اسلئے کہ مجنوں کے گھر صحرا میں کوئی دروازہ نہیں تھا جس میں داخل ہوتے وقت لیلیٰ کو کوئی رکاوٹ ہوتی

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا؛
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؛
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا؛
حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؛
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؛
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؛
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؛
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا؛
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ [۱]
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا؛

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؛
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؛
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

[۱] مرزا غالب نے یہ نہیں بتایا کب یہ غزل کہی ہوئی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خطوط سے وابستہ نظر آتا ہے جب کہ وہ مصائب و تنگدستی کا شکار ہو کر دلی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ فرماتے ہیں:

"خوشی تو ہے یہاں تمہارا شریک ہے تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب۔ للہ الحمد، وللہ الشکر بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہا رہا وہ تو نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اچھا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی قدر سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ تمہاری قوم کے ہیں جو تم نے لو میں اب اس بوجھ کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بشرطیکہ ان لوگوں کے لو بار دجانے کے اس خواہش کو قبول کر لیا۔ یہ مقصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ گیا جہاں سے دل اکھڑ گیا چل دیا۔" مگر مرزا صاحب نے اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال مدنظر رکھتے ہوئے دلی چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے باہر نہ گئے جیسا کہ ایک خط بنام حکیم غلام نجف خاں میں لکھتے ہیں "بھائی میرا ذکر سنو۔ چھپانے جلنے میں ایک بیکی اور ذلت تھی۔"

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے   مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا   نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ (٦)   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا!   کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں   شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں   تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے   تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے   غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ   شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن   شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟   شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟   یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا؟
بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا؟

(٦) ظفر بادشاہ نے مقطع سُنا تو کہا کہ ہم تو اس وقت بھی نہ سمجھتے۔ انہوں نے کہا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ کہیں تمہیں ولایت پر غرور نہ ہو جائے

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا!
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُوبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا!
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب (۱)
حمزہؓ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

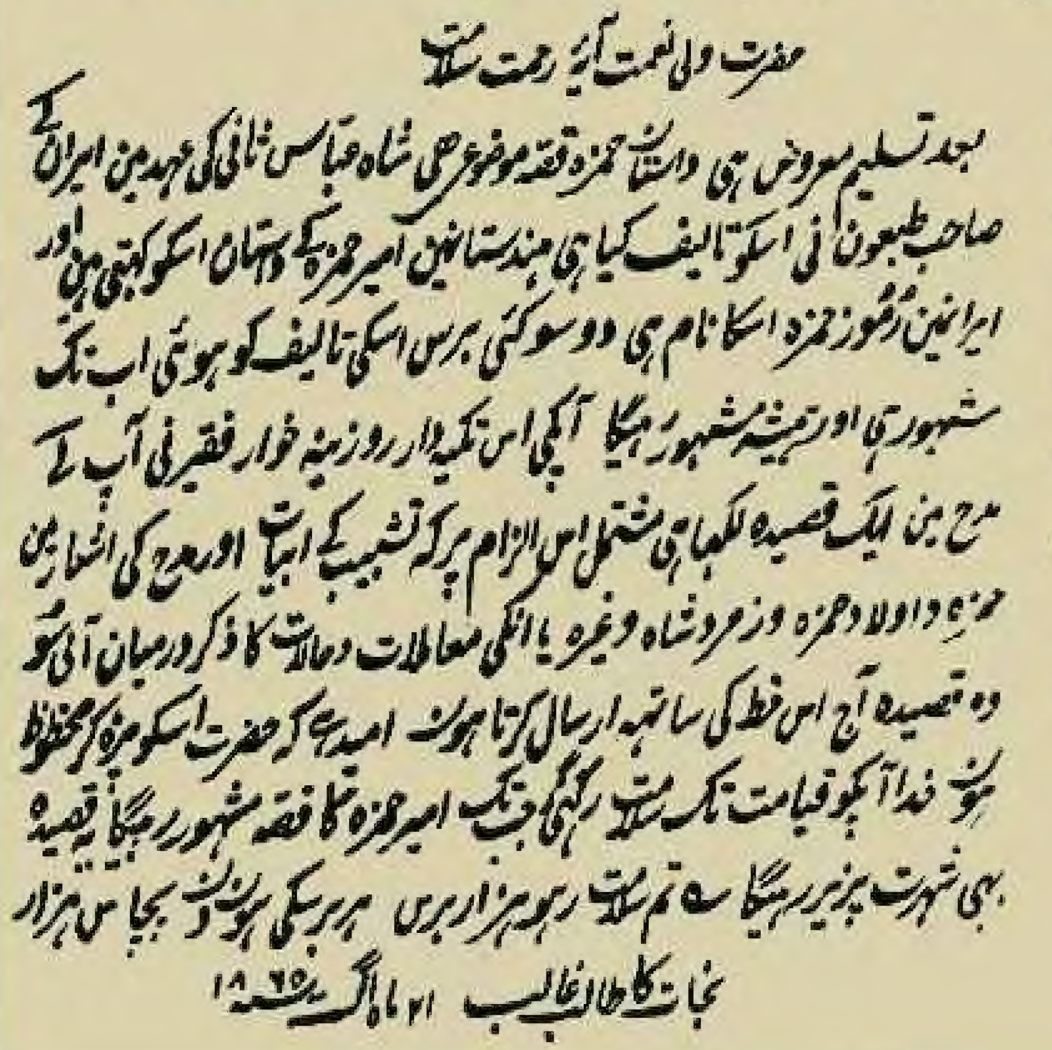

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے داستان حمزہ قصہ موضوع ہے شاہ عباس ثانی کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اسکو تالیف کیا ہے ہندستانی امیر حمزہ کی داستان اسکو کہتے ہیں اور ایرانی رموز حمزہ اسکا نام ہے دو سو کئی برس اسکی تالیف کو ہوئے اب تک مشہور ہے اور ہمیشہ مشہور رہیگا آپکا اس تکیہ دار روزینہ خوار فقیر نے آپ کے مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کے ابیات اور مدح کی اشعار میں حمزہ و اولاد حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا انکی معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئے سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں امید ہے کہ حضرت اسکو عزیز کر محفوظ رکھیں خدا آپکو قیامت تک سلامت رکھے جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہیگا یہ قصیدہ بھی شہرت پذیر رہیگا ۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب ۱۲ ماہ اگست ۱۸۶۶ء

(۱) مرزا صاحب نے داستان امیر حمزہ کے متعلق جو خط نواب کلب علیخاں کو مع قصیدہ بھیجا تھا اس خط کا فوٹو ملاحظہ فرمائیں

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا
زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفَس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے
کہ ”حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا“

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اسکے پانوں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا، سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ!
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا (۱)　میَں نہ اچھّا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟　اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ (۲)　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دِلستانی ہے؟　لے کے دل دِلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں (۱۰)　آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(۱) اس غزل کے متعلق مرزا غالبؔ نے مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھا ہے۔
"میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا وہ انہوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں"۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھیجی گئی "درد منت کشِ دوا نہ ہوا" . . . . . .

(۲) نمرود ایک بادشاہ تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور جو اُسے خدا نہیں مانتا تھا اُس پر بڑا ظلم کرتا تھا۔
اس خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی نمرود کا عہدِ حکومت تو نہ تھی جس میں مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس خدائی میں تو میری آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہونی چاہیے تھیں۔ بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ بندہ ہونا ہے۔

(۱۰) یہ غزل قلعۂ معلّٰے کے مشاعرہ میں مرزا صاحب نے پڑھی تھی چونکہ طرحی غزل نہیں کہی تھی۔ اس لیے لوگوں کے اصرار پر یہ غزل سنائی جس کا اظہار مقطع میں کیا گیا . . . . . ع کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں الخ

گِلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا گُہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دُنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بنِ مُو کام چشمِ بینا کا
دل اُسکو، پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا؟
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد جفا میں اُس کی ہے اندازِ کارفرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفَس پرور ہوا (۹) خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۹) خط بنام عبدالجمیل جنوں میں غزل گم ہو جانے کی بات خوب پیدا کی ہے اور شعر مذکورہ کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے

جناب عالی وہ غزل جو آپ کا ارسال تھا وہاں نہیں پہنچا اب میں کیا والا جو بیخ مدعا یہ کہ
گم ہو گئی سو کہاں سے میں پیدا کر کے بھیجوں مجھے نظر ثانی کا بھی تک تقدیم و تاخیر مصرعین
کرنے رشتی اور اسمیں کو بھی مستقیم نہیں مدعا بر آری کا محتوی الفاظ میں اصطلاح کی الفاظ
سے احتراز کرتا ہوں مگر جو کہ دے حیثیت مجھے ۔ لفظ صحیح ہے مضائقہ نہیں ۲
قطرۂ مے ۔ اس مطلع میں خیال ہی دقیق کا ہے مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لطف یاد
نہیں قطرہ شیشے سے بے اختیار بقدر بہ رمز مدن ثبات و قرار ہے حیرت از اں
حرکت کرنے ہی قطرہ می افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا برابر برابر بوند بوند تمام گرہ
گئیں تو پیالی کا خط مثل تعجب اوس قطرے کا بن گیا جس میں موتی پروئے ہوئے ہوں ۲

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالبؔ!
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مَیں، اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا
درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخُن گرہ کُشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گِلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعدِ یک عمرِ ورع بار تو دیتا، بارے (۱۰)
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (۱۱)
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا؟
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہ ہوتا گر جُدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

---

(۱۰) رضواں جنت کے داروغہ کا نام ہے۔ ورع، تقویٰ، پرہیزگاری۔ بار دینا، داخلہ کی اجازت دینا۔ ایک عمر کی پرہیزگاری کے بعد رضوان تو جنت میں داخلہ کی اجازت دیدیتا ہے۔ کاش وہی تیرے گھر کا دربان ہوتا تو میرے شوق اور محبت کو دیکھ کر یہاں بھی داخلہ کی اجازت دیدیتا لیکن تیرا دربان بڑا سخت ہے اور کسی صورت سے بھی داخلہ کی اجازت نہیں دیتا۔

(۱۱) جب تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب بھی خدا موجود تھا۔ اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہر جگہ موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں مدغم ہوتا یعنی میری ہستی ہی میری بربادی کا باعث ہوئی۔ یہ نیستی ہی اچھی تھی۔"

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا   یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟   کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے (۲)   تریاکیٔ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے   پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غُبار   یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا ۔ بساطِ نشاطِ دل   ابرِ بہار خُم کدہ کس کے دماغ کا!

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا   رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز (۲)   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

(۲) جس طرح چنڈو پینے والے چراغ کی لَو سے افیون جلا کر اس کے دھوئیں کا کش لیتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی شاعری کے نشے کا پرانا عادی ہوں اور اس نشہ کو ترک نہیں کر سکتا۔ شعرا بھی رات کو بیٹھ کر فکرِ سخن کیا کرتے ہیں۔ دُود سے فکرِ سخن اور چراغ سے خوش کلامی مقصود ہے اور میں فکرِ سخن کا زمانۂ قدیم سے خوگر ہوں۔

(۲) اس شعر کی شرح خود مرزا صاحب نے ماسٹر پیارے لال آشوب کے خط میں اس طرح کی ہے "پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے فولاد کی جب چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے مصرع "چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا" یعنی ابتدائی سن تمیز سے مشق جنوں ہے ابتک کمال فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثارِ جنوں میں سے ہے"

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام   رُخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخُو ہوگا   نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی   ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ   دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسدؔ   غلطی کی کہ جو کافر کو مُسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا   دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی   پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عُذرِ واماندگی اے حسرتِ دل   نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا؟
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا
آہ۔ وہ جرأتِ فریاد کہاں   دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال   دلِ گُم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے (۱۰)   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ (۱۱)   سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۱۰) اسی مضمون کا ایک شعر مومن نے بھی کہا ہے ؎ جائیں دشت میں سوئے صحرا کیوں؟   کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
اسی طرح ایک شعر قابلِ مطالعہ ہے ؎ یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(۱۱) مجنوں۔ دیوانہ۔ جب کوئی عاشق دیوانہ وار کسی راہ سے گذرتا ہے تو لڑکے اس کے پتھر مارتے ہیں۔ اسی طرح میں نے بھی بچپن میں مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا کہ دفعتہً مجھے اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے کبھی میں بھی دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھ پر بھی پتھر ماریں۔

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا   آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ   اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں   کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا!
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد   ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی (۶) گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟   نالہ کرتا تھا۔ و لے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام   ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی   آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
ریختے کے تُمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا (۱) زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بد گُمانی   میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

---

(۶) حضرت یوسفؑ کی کہانی عام ہے کہ وہ ایک مرتبہ غلاموں کی طرح بازار میں فروخت ہوئے تھے۔ لائقِ تعزیر: سزا کے قابل۔ میں نے اپنے محبوب کو انتہائی حسین ہونے کی وجہ سے یوسف کہہ دیا گویا ایک غلام سے تشبیہ دیدی، وہ تو خیریت ہوئی کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں واقعی سزا کے قابل تھا۔ یوسف کو زلیخا نے بازار میں ایک غلام کے طور پر خریدا تھا۔

(۱) لبِ خشک۔ پیاسا، آرزومند۔ در تشنگی مردگاں۔ پیاس سے مرے ہوئے لوگ۔ جو لوگ کسی خواہش کی حسرت میں ناکام مر گئے ہیں میں ان لوگوں کا لبِ خشک ہوں یعنی ان کی آئینہ داری کر رہا ہوں اس لیے محروم قسمت لوگوں کی زیارتگاہ بن گیا ہوں۔

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے (۲)　　خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں (۵)　　یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک (۶)　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل　　آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا　　رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا　　کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　　دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں؟　　جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

---

(۲) مہِ نخشب: وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا۔ وہ چاند چاہِ نخشب سے نکلتا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دور تک نہ جاتی تھی وہ اصل چاند کے برابر روشن نہ تھا۔ آخر کار کچھ عرصہ بعد شق ہو گیا۔۔

کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنانا شروع کیا! ابھی اس کی روشنی تیرے حسن و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اس کا حال بھی ماہِ نخشب کی طرح ہوا۔

(۵) مرزا صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو تحریر فرماتے ہیں: پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے ؎ میں سادہ دل . . . .

(۶) دریائے معاصی گناہوں کا دریا۔ تنک آبی۔ پانی کی کمی۔ کم مائیگی

میرے گناہ کرنے کا حوصلہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اگرچہ گناہوں کے دریا کا پانی کم مائگی کی وجہ سے خشک ہو گیا ہے مگر ابھی تک میرے دامن کا سرا تک تر نہیں ہوا یعنی میں نے اتنے زیادہ گناہ کیے کہ اب ارتکاب کیلیے کوئی گناہ باقی نہیں رہا پھر بھی میری خواہشِ گناہ پوری نہیں ہوئی۔

ذوق نے بھی اس شعر کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ غالب کو اپنے اچھے اشعار کی بھی خبر نہیں اور یہ شعر پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ (آبِ حیات)

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غُرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا (۱)
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوے
ہوں شمعِ کُشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
بر رُوے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہاے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہواے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سواے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ "اُس کا غیر سے اخلاص حیف!"
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"
ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہاے لیلیٰ آشنا

(۱) مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو جانو ع

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کوئی دم ایسا نہیں کہ مجھ کو دم واپسیں کا خیال نہ ہو، ساٹھ برس کا ہو چکا اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، قطعہ، رباعی، فارسی، اُردو دس ہزار بیت کہہ چکا اب کہاں تک کہوں گا، زندگی بُری بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھیے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا درپیش آتا ہے اور پھر لکھتے ہیں ؎

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے   عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے   میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ (۶)   سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب؟   آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں   انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا   ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دشمن کو   دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے؟ (۸)   بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے (۱)   کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم   تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

---

(۶) کوہکن: پہاڑ کھودنے والا، مراد فرہاد۔ اے اسدؔ فرہاد کو شیریں کی تصویر نقش کرنے ہی میں کمال حاصل تھا لیکن پتھروں پر تصویر بنانے سے معشوق نہیں ملا کرتا۔ اس کے لیے جذبِ صادق اور عشقِ کامل کی ضرورت ہے۔

(۸) کہا جاتا ہے کہ تمام مصیبتیں آسمان سے ہی نازل ہوتی ہیں لیکن آسمان تو دانا اور ہنرمند کا دشمن ہوتا ہے ہم کہاں کے دانا اور ہنرمند ہیں، وہ بے سبب ہمارا دشمن بن گیے۔ اپنی ہنرمندی کا اظہار کس عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔

(۱) مرزا صاحب فرماتے ہیں: "میرے کلام کا فیض مفت اور عام ہے جو فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے۔ اس کی قیمت یہ ہے کہ بصیرت حاصل کرنے والے اس فیض رسانی کی قدر کریں اور میرے کلام کی عظمت کے قائل ہوں۔" بجا فرمایا ہے

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں   بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ   صیدِ ز دام جَستہ ہے اِس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مَقتل میں کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے   پُرگُل خَیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ   پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا!

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟ (۱)   کہتے ہیں" ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!"
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں (۲)   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟   یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے   آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ (۳)   مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۱ و ۲) مرزا صاحب ایک خط میں حاتم علی مہر کو یوں تحریر فرماتے ہیں: "میں نے کتابیں جابجا بھیجیں بسبیل پارسل ارسال کی۔ اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے مگر نوید کہیں سے نہیں آئی   رات دن گردش میں ہیں . . . . الخ
دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیا ہے۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ؛ کہتے ہیں" ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!"
اس کے علاوہ ایک خط بنام مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صلاحیت علمیت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں: "کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے فراغ۔ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی اور اپنا یہ شعار دو سیرے ورد زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

(۳) نواب فواد الدولہ سید الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں: "اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔ ... عمر بھر دیکھا ... الخ"
پھر مرزا صاحب نے حقیر کو ایسا ہی لکھا "زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی۔ اب فکر ہے کہ دیکھیں موت کیسے ہوتی ہے اور بعد موت کے کیا درپیش آتا ہے"

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داریِ ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد   تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام   مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس   کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ   چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب   [۱] دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت، وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا، غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم، کہ عجب کیا ہے، اگر   موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو   موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

[۱] ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگِ مرمر کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت نو عمر لڑکے ان حوضوں میں اتر کر انگوروں کو پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی منہ بند صراحیاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں۔ انہی صراحیوں کو بطِ مے کہتے ہیں۔

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصوّر میں ز بس، جلوہ نما موجِ شراب
نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گُل! رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گُل دیکھ، اسدؔ پھر ہُوا وقت، کہ ہو بال کُشا موجِ شراب

ت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی، درخورِ عقدِ گہر، انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر، انگشت
لکھتا ہوں، اسدؔ! سوزشِ دل سے سخنِ گرم تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت
رہا گر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت (۱)
جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب لکھے ہے، خداوندِ نعمت سلامت!
علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک، سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنے! تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(۱) بظاہر تو اس شعر کے معنی یہی ہیں کہ چاہے کسی کی زندگی روزِ قیامت تک کیوں نہ ہو لیکن ایک نہ ایک دن اُسے مرنا ہی پڑے گا لیکن لفظ "حضرت" سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشارہ حضرتِ خضر کی طرف کیا گیا ہے کیونکہ جنابِ خضرؑ کے سلسلہ میں مرزا صاحب نے اکثر شوخیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ مثلاً ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضرؑ حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرتِ خضر اگرچہ قیامت تک سلامت رہیں گے مگر ان کو بھی قیامت کے دن مرنا ہی پڑے گا۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ (۱)   یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟

آمدِ خط سے ہُوا ہے سرد جو بازارِ دوست   دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر (۲)   کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے   صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے   کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن! کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے   دیدۂ پُر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پُرسش اُسکے ہجر میں   بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تا کہ میں جانوں کہ ہے اُسکی رسائی واں تلک   ق   مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ   سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر   ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے   یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست؟
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ   ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ! ز بس تکرارِ دوست

---

(۱) عالمِ نزع میں میرے احباب محبوب کو اُس وقت میرے پاس لائے جب میں اس کے انتظار میں بار بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا گویا انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کیلیے بند ہو گئیں اور میں اُسے دیکھ بھی نہ سکا۔ حسرت کی انتہا ہے۔ اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب نے اور بھی کہا ہے

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے   خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

(۲) اس شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب وہ جلوۂ دیدارِ خدا کی تاب نہ لا سکے تھے اور بیہوش ہو گئے تھے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ ربِّ اَرِنی (اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے) خدا کی طرف سے جواب ملا لَن تَرانی (اے موسیٰ تم نہیں دیکھ سکتے)

مرزا صاحب فرماتے ہیں اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق سے کام لے۔ جلوۂ دیدارِ دوست کی کون تاب لا سکتا ہے۔

ج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج   قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ   تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام چل (۳)   سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
لو ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں (۱)   اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

چ

نفَس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ   برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل!   کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے، بہ حسرت، نظارۂ نرگس   بکوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز   نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ نہاں (۶)   بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

---

(۳) سیلابِ گریہ سے دیوار و در گر جائیں گے۔ لہٰذا آسایش و اطمینان رخصت ہوا۔

(۱) مسیحا کو شکایت ہے کہ بیمارِ محبت کی تیمارداری صحیح طور پر نہیں ہو رہی ہے۔ تو ہم بیمارِ عشق کے تیماردار بنے جاتے ہیں۔ اگر بیمارِ محبت اچھا نہ ہوا تو پھر چارہ گر کا کیا علاج کیا جائے گا یعنی کیا سزا ملے گی۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ عشق کے آگے مسیحا بھی عاجز ہے۔ وہ اپنا قصور بیماردار پر ڈال رہا ہے کیونکہ مریضِ عشق لاعلاج ہے۔ حضرت عیسیٰ کا یہ معجزہ تھا کہ وہ جنبشِ لب سے مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

(۶) قدح۔ پیالہ۔ صہبا۔ شراب۔ سُفرہ۔ دسترخوان۔ میرے ساغر میں سُرخ شراب ہے۔ وہ باطن میں محبت کی آگ ہے۔ جو سُرخ سیال کی صورت میں چھلک رہی ہے۔ اس لیے میرے دسترخوان پر دلِ سمندر کے کباب ہونے چاہئیں۔ سمندر ایک کیڑا ہوتا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں پانی کی صورت میں آگ پی رہا ہوں تو کھانے کے لیے بھی آگ ہی کے کباب ہونے چاہئیں۔

د

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بُجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا میرے بعد
خُوں ہے دل خاک میں، احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد
ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد
کون ہوتا ہے، حریفِ مے مردافگنِ عشق؟ ،
ہے مکرّر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

،، مے مردافگنِ عشق۔ مرد کو پچھاڑ دینے والی عشق کی شراب۔

میرے مرنے کے بعد ساقی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مئے مردافگن عشق کا حریف ہو، یعنی عشق کی شراب کا جام پیے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے مایوس ہو کر کہتا ہے کہ حریف مے مردافگن عشق کون ہو سکتا ہے، یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔

اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں۔ اس مصرعہ کو مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق" یعنی کوئی ہے جو مئے مردافگن عشق کا حریف ہو، پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف . . . ." یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز؟ اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

ر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مےِ جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں، تو سایے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے، بن تیرے، گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر؟
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟   جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے (۲)   سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا؟   رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے   مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق   لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ (۷)   لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زُنّار باندھ سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال   رَہرَو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

(۲) آتش پرست۔ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کی عبادت گاہوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔
فرماتے ہیں: محبوب کی جدائی میں جو میں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برسانے والے نالے نکلتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتش پرست کہنے لگے ہیں۔

(۷) متاعِ سخن۔ کلام کی دولت۔ ہم اپنے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن فہم اور سخن شناس ہو۔
اس سلسلہ میں منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے متعلق لکھتے ہیں۔ یہ خط کتنا حسرت آمیز ہے

"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جس نے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں۔"

"مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنے کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمتِ دنیا پر قانع۔" (از یادگارِ غالب)

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طُور پر (۱)   دیتے ہیں، بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا   یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر   میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی (۲)   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے   کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے!   بہم گر صُلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اِقلیمِ اُلفت میں کوئی طُومارِ ناز ایسا   کہ پُشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا   کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا   قیامت اِک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی؛   ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۱) برقِ تجلّی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلوہ دکھایا بس ایک بجلی کی مانند روشنی آنکھوں کے سامنے آگئی حضرت موسیٰ جلوہ کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوگئے اور کوہِ طور جل گیا۔ برقِ تجلّی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہِ طور۔

فرماتے ہیں کہ برقِ تجلّی ہم پر گرنی چاہیے تھی کوہِ طور پر نہیں اس لیے کہ وہ برداشت نہ کر سکا اور جل گیا۔ اگر ہمیں وہ جلوۂ دیدار دکھاتے تو ہم برداشت کر لیتے ہماری ایسی حالت نہ ہوتی۔ شراب خوار کے ظرف کو دیکھ کر اس کی برداشت کے مطابق شراب دیجاتی ہے۔

(۲) حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے دوسرے بھائی ان سے بہت جلتے تھے۔ ایک دن سب بھائی ان کو شکار کے بہانے جنگل میں لے گئے اور ان کو ایک کنوئیں میں دھکیل دیا۔ گھر آکر اپنے باپ سے کہدیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ حضرت یعقوبؑ بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسفؑ کی یاد میں روتے روتے اندھے ہوگئے۔

اُدھر یوسفؑ کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیزِ مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ حضرت یوسفؑ کے حُسن جمال پر عاشق ہوگئی لیکن حضرت یوسفؑ نے اس کی کوئی بات نہ مانی۔ آخرکار مایوس ہوکر اور ان پر الزام لگا کر ان کو زنداں میں ڈالدیا۔ اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت یوسفؑ نے خانہ آرائی نہ چھوڑی۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی سفیدی زنداں کی دیواروں پر پھر پھر کر اُسے آراستہ بنا رہی تھی یعنی حُسن کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں مَحبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند؟
ہے تیر مُقرّر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اِس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور"

لوگوں کو ہے خُورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

(۹) لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۱۱) ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(۹) مرزا غالب نے اس شعر کی تشریح جنوں کو یوں لکھی ہے

"لیتا نہ اگر دل" یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ جملے میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب ہے، تعقیدِ لفظی جائز بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ: اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا، اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

نیز یہ پوری غزل (اس ایک شعر کو چھوڑ کر) مرزا صاحب نے حاتم علی مہر کو ارسال فرمائی تھی۔ علاوہ ازیں اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے" نواب علائی کو اپنی یادداشت پر بھیجی تھی۔

(۱۱) خودستائی سے پہلو بچاتے ہوئے اپنے کلام کو کس انداز سے سراہا ہے۔ بظاہر دوسروں کی تعریف کی ہے مگر اصل میں اپنی سخنوری کا اظہار مقصود ہے۔ اگرچہ یہ بالکل سچ ہے مگر اپنی تعریف دوسروں کی زبان سے کی ہے۔

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
"کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور (۱)
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
'مانا' کہ ہمیشہ نہیں اچھا، کوئی دن اور

(۱) یہ غزل نہیں مرثیہ ہے، مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارفؔ کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے تھے جبکہ ان کی عمر ۳۵ برس کی تھی۔ مرزا صاحب کے اپنے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا لہٰذا زین العابدین خاں کو جو اُن کی سالی کا لڑکا تھا متبنٰی بنا لیا۔ زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے۔ ان کی اچانک موت کا مرزا کو نہایت صدمہ ہوا اور یہ دلدوز مرثیہ لکھا۔ چونکہ اسی سال مومنؔ اور تسکینؔ بھی گزرے تھے اس لئے سالکؔ نے یہ تاریخ کہی تھی ؎

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر
ارم میں عارفؔ و تسکینؔ و مومنؔ

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور؟
تم کون سے تھے ایسے کھرے دادو ستد کے؟
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور؟
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ"
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادفن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز
ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے گرمیِ رفتار ہنوز

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز؟   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے   ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ (۳)   واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی   ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے   ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں   جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز   اے ترا ظلم سر بسر انداز!
تُو ہُوا جلوہ گر، مبارک ہو   ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہُوا   میں غریب اور تُو غریب نواز
اسدُاللہ خاں تمام ہوا   اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

---

(۳) مرزا صاحب نے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھا۔

کیوں ترکِ لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اُتار کر پھینکو گے ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سُستی، رنج و آرام کو ہموار کرو جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

نیز نواب علائی کو بھی لکھا:

" بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جابر خبردار میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں" ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے! (۱)
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پائے نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام (۱۳)
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

(۱) مرزا صاحب نے ایک اور جگہ فرمایا ہے ۔ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ؛ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

(۱۳) ایما: اشارہ۔ قصہ تمام کرنا: زندگی ختم کرنا یعنی شمع شعلہ کا اشارہ پاتے ہی اپنے کو ختم کر لیتی ہے اور فنا کے درجہ کو پا جاتی ہے۔

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے، اے اختیار! حیف!
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفَسِ شعلہ بار! حیف!

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو!
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم، مثلِ خندۂ قاتل، ہے سراپا نمک
یاد ہیں، غالب! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک؟

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک؟
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا، اسد، کس سے ہو جز مرگ علاج؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل سر بہ پائے گُل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے، بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل
سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل
غالبؔ، مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گُل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر   متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں، اے خدا!   رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم!

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، و لے   غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟   ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا   شورِ سودائے خط و خال کہاں؟
تھی وہ اک شخص کے تصور سے   اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں لہو رونا   دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق   واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟
مضمحل ہو گئے قوےٰ، غالبؔ (۱۲)   وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

(۱۲) مرزا صاحب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو یوں لکھتے ہیں:

"بندہ نواز زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ   وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے۔ اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔" اسی مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمرِ ناپائیدار کو پہنچ کر آفتابِ لبِ بام اور بہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔" آثار ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں   ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے   کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، اِنھیں کچھ نہ کہو   جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے   اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجُود (۵)   قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے (۶)   خارِ رَہ کو ترے، ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا!   آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ   اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید (۹)   "مر گیا غالبِ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

(۵) ادراک، سمجھ۔ مسجود، جس کو سجدہ کیا جائے۔ خدا کی ذات۔

قبلہ: جس طرف کو اہلِ اسلام منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اسے کعبہ بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں قبلہ کی طرف منہ کر کے جو نماز پڑھتا ہوں تو قبلہ کو سجدہ کرتا ہوں یہ بات بالکل غلط ہے قبلہ تو اس معبودِ حقیقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے میں جس کو سجدہ کرتا ہوں وہ ذاتِ حقیقی تو زمان و مکاں سے بھی بالاتر ہے۔ اور اس تک عقل و فہم کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

(۶) مہر گیا۔ ایک قسم کی گھاس جس کے متعلق روایت ہے کہ جو اس کو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں گویا یہ محبت کا اثر رکھتی ہے۔ جب سے تجھے رحم آیا ہے ہم نے یہی سمجھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے "مہر گیا" کا اثر رکھتے ہیں اور انہی کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے۔

(۹) آشفتہ نوا۔ پریشان باتیں کہنے والا۔ وحشت و شیفتہ دونوں مرزا کے ہمعصر شاعر اور خاص دوست تھے۔

اس شعر میں وحشت و شیفتہ کے الفاظ نے خاص خوبصورتی پیدا کی ہے۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفتہ کا نام نواب مصطفٰے خاں تھا وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے۔ شیفتہ صاحب ایک مانے ہوئے سخن فہم اور سخن سنج تھے جو دلی میں رہتے تھے وہ مرزا صاحب کی عظمت کے حد سے زیادہ معتقد اور قدر شناس تھے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں (۲)
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیُولیٰ ہے نئے ناسُور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قُلزُم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جُھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

عُہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدانکردہ تجھے بیوفا کہوں

---

(۲) فرماتے ہیں کہ ضعیفی سے خون کی قلت ہے جسم و چہرہ کا رنگ پیلا پڑ گیا اور آنسوؤں کی شکل میں بہہ بہہ کر رنگ کی طرح اُڑ گیا۔ اس طرح ایک اور شعر بھی ارشاد فرمایا ہے ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے! بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر، ورنہ (۲) کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو اس بُلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں (۱) رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
دَھول دَھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

---

(۲) اس غزل کے متعلق عرشی صاحب رامپوری نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں: جناب حامد حسن قادری نے نہایت دلچسپ اطلاع ہم پہنچائی۔ اپنے مکتوب بنام حیرت شملوی میں رقمطراز ہیں میرے پاس بزرگوں کے وقت کا دیوان غالب ہے۔ اس میں میرے والد مرحوم کے قلم سے دو شعر یہ لکھے ہیں

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباں گڈھ مکتیسری غالب کے زمانے کے ایک بزرگ تھے۔ ممکن ہے غالب نے دیوان چھپنے کے بعد یہ شعر کہے ہوں۔ بہرکیف اشعار کا انداز اور مرتبہ سابقہ اشعار کے ہم پلہ ہیں

(۱) مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا صاحب قرضدار ہو گئے۔ قرضخواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب کیے گئے۔ مفتی صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جب وقت پیشی میں گئے انہوں نے یہ شعر پڑھا: قرض کی پیتے تھے مے الخ آزردہ نے مدعی کو روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ اور اس طرح مرزا غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے۔

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں   اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا!   پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز (۳)   نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی   آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
ہرچند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے   ہرچند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے   لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو   ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دونیم   دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب   سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟   گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی (۱)   روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی   غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۳) محبوب نے جور و ستم کے لیے مجھے منتخب کیا ہے تو اس کی یہ ادا بھی مجھے عزیز ہے۔ گویا نامہربانی ہی میرے لیے مہربانی کا سبب ہے

(۱) روح القدس سے مراد فرشتہ جبرئیل ہے جو فرشتوں کی جماعت میں سب سے بلند مرتبہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ جبرئیل اگرچہ میری زبان نہیں جانتا پھر بھی اس سے اپنے کلام کی داد مجھے مل جاتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جبرئیل تو میرے کلام کی داد دے اور لوگ اس کی قدر نہ کریں۔ مصرعۂ اولیٰ میں "کچھ" بہت پُر لطف ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ پوری داد تو جبرئیل بھی نہیں دیتا یعنی میں اس سے بھی زیادہ داد کا حق رکھتا ہوں۔ دوسرا مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرا کلام الہامی ہے۔ اس لیے جبرئیل ہی سے کچھ اپنے کلام کی داد پاتا ہوں۔ حالانکہ وہ میرا ہم زباں نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک اور جگہ مرزا صاحب نے کہا ہے ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں   ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے   جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید، گوارا رہیو   خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے   لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رُخصتِ بیباکی و گستاخی دے   کوئی تقصیر بجُز خجلتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ (۱)   "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

مت مردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں   ہیں جمع سُوَیدائے دلِ چشم میں آہیں

برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے   کھل گئی مانندِ گُل سَو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویِ وارستگی   سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۱) میر تقی میر کی غزل گوئی اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر شاعر نے اعتراف کیا ہے۔ ذوق نے کہا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب   ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا نے بھی کہا ہے ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ   ہونا پڑا ہے میر سے اُستاد کی طرف

غالب جیسے بلند اور گراں پایہ شاعر کا اس رائے سے اتفاق کرنا میر تقی میر کے بلند پایہ شاعر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا جیسا کہ انہوں نے کہا ہے

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا"

ناسخ لکھنؤ کے مشہور شاعر اور اپنے زمانے کے اُستاد تھے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت نہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالب نے مقطع میں ناسخ کے مصرعۂ ثانی کو باندھا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں   جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے (۲)   جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود   ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے   ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے   غمِ محرومیِ جاوید نہیں
”کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ“   ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں (۷)   خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے   سُوَیدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری   تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے   کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ   تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۲) خاتمِ جمشید: ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک نہایت قیمتی انگوٹھی تھی جس پر اس کا نام کندہ تھا وہ اسی کے لیے مخصوص تھی فرماتے ہیں جامِ مے کی سلطنت میخواروں کو جمشید سے دست بدست ملی ہے یہ کوئی خاتمِ جمشید نہیں ہے جو جمشید کے لیے مخصوص تھی اور دوسرے اس سے محروم رہتے گویا ہمارا جامِ مے قدر و قیمت میں خاتمِ جمشید سے کم نہیں ہے۔ شعر کہا ہے ؎
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ؛ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے۔ یہاں اپنے مے کے جام کو جامِ جمشید سے فضیلت دی ہے۔

(۷) جس طرح نقشِ قدم دیکھ کر مسافر کے آنے اور جانے کا راستہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم داغِ دل سے اپنے نالے کی حرارت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ داغ کو نقشِ قدم سے تشبیہ دی ہے۔

ملتی ہے خُوئے یار سے نار التہاب میں (۱) کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں؟ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو مُنکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں!؟
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندرِ نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا (۲) لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

---

(۱) نار: آتشِ دوزخ۔ التہاب: شعلوں کا بھڑکنا۔ فرماتے ہیں: محبوب کی بدخوئی بھی میرے لیے سامانِ راحت ہے۔ دوزخ کی آگ بھی شعلہ زنی اور بھڑکنے میں اس کی خو سے مشابہت رکھتی ہے اس لیے یہ بھی میرے لیے سامانِ راحت ہے اگر میں ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے۔

(۲) لگاؤ: لگاوٹ یا محبت مراد ہے۔ فرماتے ہیں: دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصرعِ ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہم پلہ اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا رہتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں آنکھ چرانا لگاوٹ سے بھی زیادہ دلفریب ہے۔ اسی طرح معشوق بناؤ سنگار میں نہایت دلفریب ہوتا ہے مگر اس کا غصے سے بگڑنا اس کے بناؤ سے بدرجہا دلربا ہو جاتا ہے۔

مولانا آزردہ جو ہمیشہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور مرزا کی پیچیدہ گوئی پر حرف رکھتے تھے۔ اس شعر کو سن کر نہایت خوش ہوئے مگر طنزاً بطور مزاح یہ کہا: یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے۔ اس میں مرزا کی کون سی خوبی ہوئی۔

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں   یہ سُوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند (۲)   گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟   گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے (۴)   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے (۵)   جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے (۶)   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر (۷)   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی   ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست   مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُوتراب میں

(۲) جب خدا نے حضرت آدم کو خاک سے پیدا کر کے اس میں جان ڈالی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدۂ تعظیمی کریں تو سب فرشتوں نے اس کی تعظیم کی لیکن ابلیس (شیطان) نے نہیں کی اور کہا میں آگ سے بنایا گیا ہوں اور یہ انسان مٹی سے میں اس سے افضل ہوں۔ اسلیے اسے سجدہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ حکم عدولی و گستاخی پسند نہ آئی اور اسے اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کل تک تو ہماری یہ قدر و منزلت تھی کہ ہماری جناب میں اگر فرشتے نے گستاخی اور بےادبی کی تو اسے بارگاہ سے نکال دیا۔ آج ہم اتنے ذلیل ہیں کہ ہماری پستی انتہا کو پہنچ چلی آخر اس کی کیا وجہ ہے اور بارگاہِ الٰہی نے اتنا ناقابلِ التفات کیوں سمجھ لیا ہے۔

(۴) منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں، ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی گرانی رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں

(۵، ۶، ۷) اشعار میں ذاتِ واحد کا ہر شے میں موجود ہونا ظاہر کیا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی ذات دنیا کی ہر شے میں جلوہ گر ہے اور اس طرح قطرہ و موج اور حباب کی کوئی ہستی نہیں۔ یہ سمندر ہی کے اجزا ہیں۔ یعنی ممکنات کی ہستی وجوبِ واجب ہی کے ضمن میں ہے آگے فرماتے ہیں۔ عارف کو تمام موجوداتِ عالم جو نظر آتے ہیں اس کو شہود کہتے ہیں۔ دیکھنے والا شاہد ہے اور جس کو دیکھا جائے مشہود۔

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں   مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو مَیں"؟
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش! جانتا نہ تری رہ گزر کو مَیں
ہے کیا، جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو مَیں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"   یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو مَیں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار   کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو مَیں؟
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوے یار   جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو مَیں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا   سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو مَیں
غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز (۱۰)   دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو مَیں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں   غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق (۱۱)   مژدۂ قتل مُقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

(۱۰) مقطع میں نواب علی بہادر خاں والیِ باندہ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے مرزا غالب کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ ایک خط میں انوار الدولہ شفق کو یوں تحریر فرماتے ہیں: "میرے باندا بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا۔ ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر مہینہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا السبیل ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا بیمار ہو گئے (ظفر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا۔

(۱۱) مرزا صاحب نے ایک خط شاہ عالم مارہروی کو لکھا۔

مشفقی مکرمی، چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہیے گا اور یہ پیام پہنچا دیجے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہشِ وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں۔ مصرعۂ ثانی ترمیم کے ساتھ لکھا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن (۱)   ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی   عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں"   کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو   تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ   وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ (۹)   میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جُز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب! (۸)   ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم   دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب   لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

(۱) ہم بھی وہ قطرہ ہیں جو دریا کا جز ہے یعنی فنافی الذات۔ لیکن ہم کبھی حضرتِ منصور کی پیروی نہیں کر سکتے کہ سب کے سامنے یہ کہتے پھریں کہ ہم خدا ہیں اور اس طرح اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیں۔

(۹) ظہوری اور خفائی فارسی کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ظہوری کے کلام کی عوام میں بہت شہرت تھی، خفائی اتنا مشہور نہیں تھا لیکن خفائی کا کلام ظہوری کے کلام سے زیادہ بہتر تھا اور خواص میں مقبول تھا۔ دونوں شاعروں کے ناموں سے بھی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ظہوری: بمعنی ظاہر، مشہور۔ خفائی: بمعنی پوشیدہ، گمنام۔ یہ حضرتِ غالبؔ کا کمال کہ شاعروں کے ناموں سے بھی اپنا مفہوم ظاہر کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں میری حیثیت ایسی ہے جیسے ظہوری کے مقابلے میں خفائی کی تھی۔ اگرچہ میں ظہوری کی طرح مشہور نہیں ہوں لیکن میرا کلام خفائی کی طرح دوسرے شاعروں سے مشہور ہے۔

(۹) فرہاد خسرو کا رقیب تھا بعض شیریں کو دیکھنے کے لیے خسرو کے محل میں معماری کرتا تھا
عاشق کے مرتبۂ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ اپنے رقیب کا احسان اٹھائے یا اس سے مدد لے۔ فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے خسرو کے محل میں مزدوری کی اس لیے ہم عاشقی کی دنیا میں اس کی نکونامی تسلیم نہیں کر سکتے یعنی عشق اور رقیب کے گھر مزدوری باعثِ بدنامی ہے۔

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب (۹) تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟ ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں؟

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

(۹) اے غالب تم کس منہ سے غربت کی شکایت کرتے ہو اور غیروں کا رونا روتے ہو۔ کیا تم کو یارانِ وطن کی سرد مہری اور دل آزاری یاد نہیں۔ یعنی اہلِ وطن نے کتنا تمہیں ستایا اور پریشان کیا پھر پردیس میں غیروں کی بدسلوکی کی شکایت کیا ہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا   بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں ٥،
ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں   کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟
ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟   ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے   بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں   جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں مَیں تو کہتے ہیں   کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب   گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام؟   دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب   یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں   ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟   ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر!   برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم   اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گُل   مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں!
غلطیہائے مضامیں مت پوچھ   لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ   ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ   وگرنہ ہم تو توقّع زیادہ رکھتے ہیں
(۲) دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں   خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل!   انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟   لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے   آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے   لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ   رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لیے؟   کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا   وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"

(۲) خط بنام نواب کلب علی خاں، "بعدِ تسلیم معروض ہے جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے "غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا الخ" اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔"

خود نوشتہ غزل مرزا غالب مقطع کی صورت بدلی ہوئی پیش کی جاتی ہے

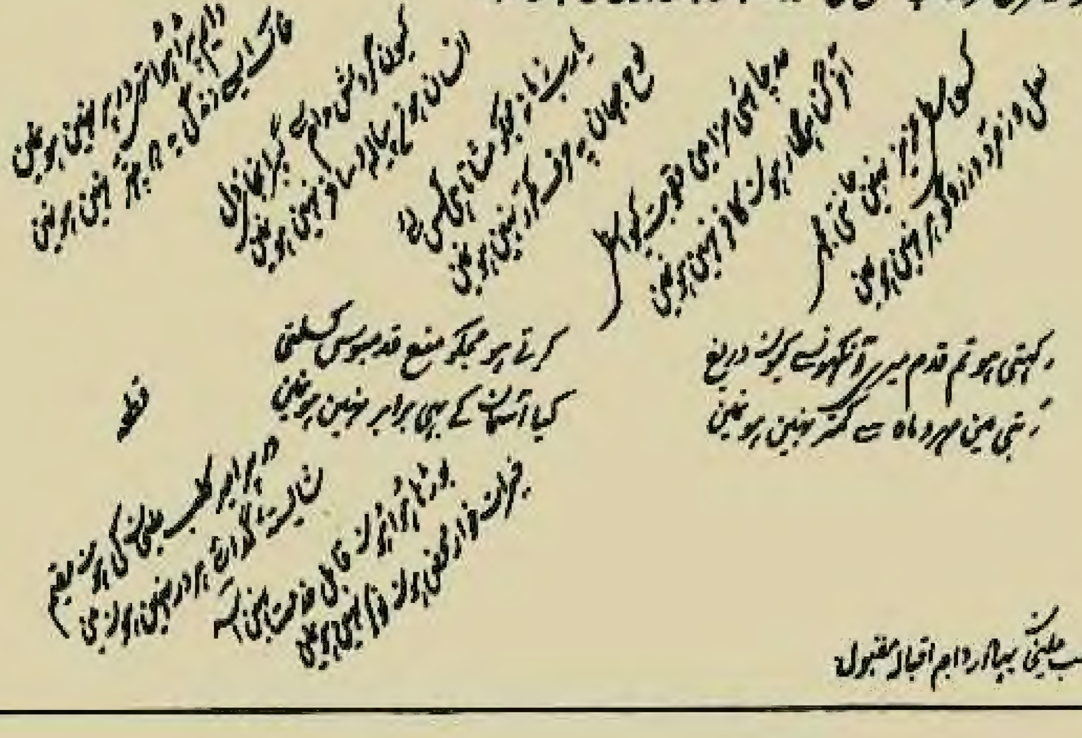

رکہتی ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبی مین مہر و ماہ سے کمتر نہین ہون مین

کرتے ہو مجکو منع قدمبوس کسلیے
کیا آسمان کے بہی برابر نہین ہون مین

قطعہ

نواب کلب علیخاں بہادر دام اقبالہ مقبول

“

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں (۱) خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں (۲) شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں
قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر (۳) لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

(۱) یہ غزل علی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا جناب مرزا نور الدین بہادر جو لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اور شاہزادہ والا تبار رونق افروز محفلِ مشاعرہ تھے۔ ایک غزل مرزائے ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں غالب کی راقمِ اخبار کے پاس پہنچی جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ غالب نے منشی حقیر کو بھی اس غزل کے متعلق لکھا ہے

”بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہزادگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل لکھی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجا لایا اور غزل لکھی۔“

(۲) شمال کی جانب سات ستارے آسمان پر قطب شمالی کے قریب ہوتے ہیں۔ عرب ان کو لڑکیاں کہتے ہیں اور ہندستان میں سات سہیلیوں کا جھمکا کہا جاتا ہے۔ نیز چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ لے جانے والے بیان کیا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں یہ سات لڑکیاں (بنات النعش) شرم و حیا کا ثبوت دینے کے لیے دن بھر تو آسمان کے پردے میں پوشیدہ رہتی ہیں مگر رات کو انہیں کیا ہوتا ہے اور ان کے جی میں کیا آتی ہے کہ عریاں و بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔

(۳) روزنِ دیوارِ زنداں سے مراد ہے، آنکھوں کا بے نور ہونا اور دوسری طرف یہ اظہار کرنا مقصود ہے کہ یعقوب نے یوسف کی خبر نہ لی لیکن حقیقت میں ان کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو کر ہر وقت یوسف کو دیکھتی تھیں۔ روزن اور نابینا آنکھوں کی تشبیہ بہت خوب ہے۔ جب آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے تو وہ سفید ہو جاتی ہیں اور روزن کے ساتھ پورے طور پر مشابہت رکھتی ہیں۔ جس طرح روزن بند نہیں ہوتا اسی طرح نابینا آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ روزن کے ذریعہ اندھیرے میں روشنی آتی ہے۔ اس لئے یعقوب کی آنکھیں روزن بننے سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ یوسف زنداں کی تاریکی سے نہ گھبرائے۔ غالب کا یہ شعر کس قدر حسین ہے اور جذبۂ عشق کو ظاہر کرتا ہے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے (۱) ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام (۲) قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
مَیں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار! جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں
بسکہ روکا مَیں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں
واں گیا بھی مَیں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں
جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا (۹) سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں! دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۱) قاعدہ ہے کہ عاشق ہمیشہ رقیبوں سے ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا اس سے مستثنیٰ رہی یعنی وہ مصر کی عورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئی جو زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہ آئیں تو ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہدایت کی کہ جب یوسف آئے تو چھری سے لیموں کاٹ دیں مگر جب یوسف سامنے آئے تو انکے جمال کو دیکھنے میں اتنی محو ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی اپنی انگلی کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب حُسن کا اثر دیکھ لیا

(۲) اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ نیک بندے جنّت میں جائیں گے اور ان کی خدمت کے لیے حوریں ملیں گی۔ از راہِ شوخی فرماتے ہیں:
یہ حسین جو آج ہمیں یہاں ستا رہے ہیں اگر قدرتِ حق سے جنّت میں حوریں بن گئیں تو ہم ان سے اپنا انتقام لیں گے چونکہ جنّت میں حوریں ہماری خدمت اور فرمانبرداری کے لیے ہوں گی اس لیے ہم وہاں ان کو اپنی خدمت اور فرمانبرداری میں مصروف رکھ کر بدلہ لیں گے کیونکہ انھوں نے ہمیں اپنی فرمانبرداری پر مجبور کر رکھا ہے۔

(۹) اس مضمون کو مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کے ایک خط میں اس طرح لکھا ہے "میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں۔ آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ رگ میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔"

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
(۳) دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے، ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظُلمت گستری میرے شبستاں کی؟
شبِ مہ ہو جو رکھدوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

---

(۳) مرزا صاحب عبدالجمیل جنوںؔ کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "ملنا ترا اگر نہیں الخ یعنے اگر ترا ملنا آسان نہیں تو یہ امر بھی آسان ہے خیر ترا ملنا آسان نہیں نہیں سہی ہم دل کو سمجھا لیں کہ نہ ہوئے اور مل سکیگا مشکل تو یہ ہے کہ وہی ترا ملنا دشوار بھی نہیں یعنے جس وقت چاہیں مل بھی سکتا ہے مگر تو ہمنے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنا اوپر آسان نہیں کر سکتے"

نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی   ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے   پَر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہُوں یا بد ہُوں، پر صحبت مخالف ہے   جو گُل ہُوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو   سیہ ہو کر سُوَیدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں
اسدؔ زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں   خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہُوئے پر ہَوا اُڑا لے جائے   وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟   کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا   اثر مرے نَفَسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں مَے کش   شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ   سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ (۱۲)   کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۱۲) اے اسدؔ ہمارے اشعار کو لوگ محض اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ اشعار کی خوبی کو نہیں پہچانتے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اچھے فن کا اظہار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مرزا کا ابتدائی کلام پیچیدہ اور مشکل پسندی سے بھرا ہوا تھا۔ جب ان سے آسان کہنے کی فرمائش کی تو انہوں نے یہ رباعی کہی

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل

اور یہ شعر بھی اسی وقت کا کہا ہوا ہے ؎

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ (۱)
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم (۲)
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

---

(۱) یہ غزل دہلی اردو اخبار میں ۱۳ر فروری ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔ اس غزل پر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہی نے ایک مخمس لکھا جس میں آخر کے دو مصرعوں میں غالب کا پورا شعر تھا۔ یہ مخمس بہت پسند کیا گیا اور بادشاہ نے پانچ مرتبہ اس کو پڑھوا کر سنا۔ اس کے علاوہ اس غزل کا مطلع "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" مرزا صاحب نے قاضی عبدالجمیل کے خط میں بھی استعمال کیا ہے۔ جب انھوں نے مرزا صاحب سے غزل طلب کی تھی۔ فرماتے ہیں:

> یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی نہ اکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا۔ اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے تو وہ مول لے کر خدمتِ عالی میں بھیجا جائے گا۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت الخ
> ایک دوست کے پاس بقیۃ النہب والغارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے۔ اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیج دوں گا۔

(۲) قاضی عبدالجمیل جنوں کو اس طرح لکھتے ہیں۔

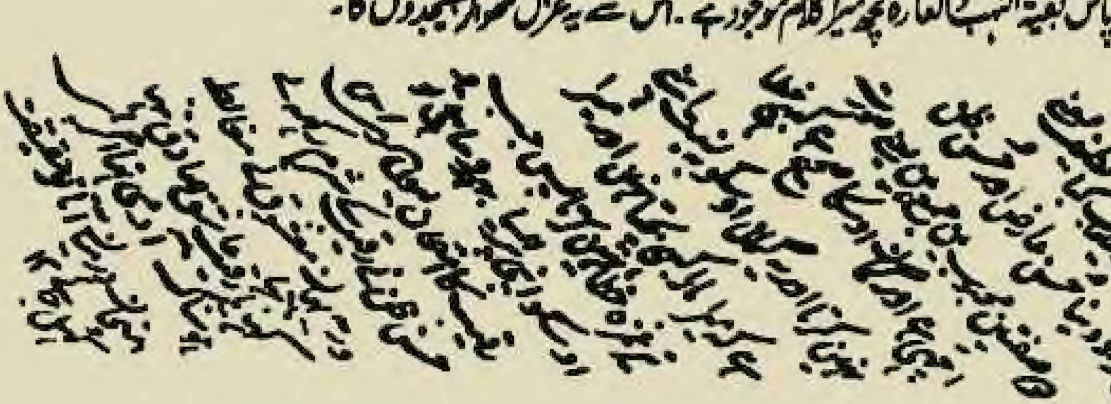

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں
پُرسشِ طرزِ دلبری، کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آوے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
”غیر سے رات کیا بنی‘ یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اُس کے رُو برُو کیوں نہ خموش بیٹھیے!
اُس کی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی“
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں؟
مجھ سے کہا جو یار نے ”جاتے ہیں ہوش کس طرح؟“
دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں
کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ”ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی؟“
گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سروقد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنشت کو؟
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
ہوں مُنحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ مَلخ کھاے کِشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں، "ہر درد کی دوا"
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو؟
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے؟
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے   مرے بُتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو   جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا؟   رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے؟   جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ   فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو   رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو (۱)   ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ   ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور   تن سے سوا فگار ہیں اِس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ   ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف   اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں   دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو
غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟   پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

(۱) جب فرہاد جوئے شیر شیریںؔ کے محل کے نیچے تک لانے میں کامیاب ہوگیا تو خسروؔ کو اپنی ذلت اور شکست نظر آئی۔ اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کرنے کے بعد ایک مکار بڑھیا کو تیار کیا کہ وہ فرہاد کو جھوٹی خبر دے کہ شیریں کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس عیار بڑھیا نے فرہاد کے پاس پہنچکر شیریں کی موت کی خبر سنائی۔ فرہادؔ نے یہ خبر سنتے ہی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لیا اور جان دے دی۔

فرماتے ہیں کہ کوہکن نے کس سادگی سے اپنی جان دے دی۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے قدموں پر فدا ہو جاؤں۔ دوسرے مصرعہ میں بڑھیا کو بد دعا دیتے ہیں کہ اس مکار بڑھیا کے پاؤں راستے ہی میں کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ وہ شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر فرہاد کے پاس نہ لے جاتی۔

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار　　یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ　　آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو　　صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو مَیں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے　　کِس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہَم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن　　تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو　　یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں　　نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا　　ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار　　پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو　　ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی (۱)　　ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر　　عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ　　جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۱) مرزا غالب جب کلکتہ گئے تو راستہ میں لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ نواب آغا میر سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ مگر سازگاری نہ دیکھی۔ غازی الدین حیدرؔ شاہِ اودھ تھے اور سیاہ سفید کے مالک نائب السلطنت سید محمد خاں آغا میر۔

غالب کے دوستوں نے آغا میر کو خبر کی کہ غالب لکھنؤ میں موجود ہیں۔ انھوں نے ملنے کے لیے رضامندی ظاہر کی اور مرزا صاحب بھی راضی ہو گئے، لیکن اپنی خودداری کا پاس رکھتے ہوئے شرط لگا دی کہ میرے پہنچنے پر آغا میر کھڑے ہو کر پذیرائی کریں اور مجھے نقد نذر پیش کرنے سے باز رکھا جائے۔ آغا میر نے یہ شرائط نامنظور کر دیں۔ غالب بھی خوددار تھے۔ لہذا ملاقات نہ ہو سکی۔ اور کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو (۱) مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟
بچتے نہیں مُواخذۂ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں مانا کہ تم بشر نہیں خُورشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار مرتا ہوں مَیں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید (۵) مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

(۱) مرزا صاحب نے نواب علائیؔ کو ایک خط میں لکھا:

اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں، عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورمنٹ کا بھاٹ تھا۔ بھٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹی متروک۔ نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آ جاتے ہیں اصلاح پا جاتے ہیں باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے۔ اور مجھ کو دیکھ جاتے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہے مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے

(۵) حالی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے کہ مسجد و مدرسہ و خانقاہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں ترنگوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد، مدرسہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر پی لینے میں کوئی عار نہیں ہے۔ یعنی یہ مقامات اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں۔ وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتنے سے کبھی نہیں چوکتے یعنی مسجد مدرسہ، خانقاہ جائے عزت ہیں مگر مرزا صاحب نے ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو؟
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو؟
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو؟
الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر ان سے امید، اور انہیں ہماری قدر ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو؟
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں غالب، ولے بقولِ حضور (۱۰۰) "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو؟"

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟ (۱۰۱) نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟
کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

(۱۰۰) یہ غزل اور غزلوں کے ساتھ دہلی کے اردو اخبار میں چھپی جب قلعۂ معلّٰی میں مشاعرہ ہوا تو اس میں یہ غزل مرزا صاحب نے پڑھی۔ غزل کے لیے طرح ہمیشہ بادشاہ ظفرؔ دیا کرتے تھے۔ مقطع میں غالبؔ نے بادشاہ کے طرحی مصرع کو اس طرح نظم کیا ؎

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

(۱۰۱) مرزا غالبؔ نے حاتم علی مہر کو لکھا کہ میں نے ان دنوں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک تو "دریا نہ ہوا" سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل "رواں کیوں ہو" "گماں کیوں ہو" اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انہیں کو لکھا:
"تم نے یہ پوچھا تا ہے کہ بار بار کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخورِ افزایش ہے" بقول غالبؔ ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
نیز یہ شعر ؎ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم (۲)   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو!
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ   کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو!
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے   نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو!
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے   ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟   عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو!
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟"   بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو!"
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب   ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو   ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے   کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیماردار (۱)   اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۲) شعر کیا ہے ایک سرگزشت ہے، ایک پرندہ قفس میں بند ہے اس نے باغ پر بجلی گرتی دیکھی ہے وہ فکرمند ہے کہ کہیں بجلی میرے آشیانہ پر نہ گری ہو سامنے ایک اور ہم صفیر شاخ پر آ بیٹھا ہے وہ جانتا ہے کہ مرغِ اسیر کے آشیانہ پر بجلی گری ہے وہ یہ واقعہ بیان کرنے سے جھجکتا ہے۔ مبادا اس کی مصیبت دوبالا ہو جائے لیکن اسیرِ قفس اس کو صاف صاف بیان کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور کہتا ہے مجھ سے چمن کی سرگزشت کہتے نہ ڈر۔ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کل جس آشیانے پر بجلی گری ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ میرا ہی آشیانہ ہو۔

ان دو مصرعوں میں اتنی بڑی کہانی بیان کرنا مرزا صاحب ہی کا حصہ ہے۔

(۱) مرزا صاحب نے یہ شعر ایک مکتوب میں بنام علاءالدین احمد خاں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:۔

مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتر کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ ہاہاہا ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیماردار   اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ نواب تفضل حسین خاں کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح سرائی میں ان کی مشہور غزل کا ایک مصرع یہ ہے۔ ؎

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ   طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ   جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے   دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

صد جلوہ رُوبرُو ہے جو مژگاں اُٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق (۵)   یعنی، ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے
دیوار، بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم   اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے   یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے   بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر   آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد، اے فلک، دلِ حسرت پرست کی   ہاں، کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری   تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو!   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(۵) برات: وہ کاغذ یا فرمان جس کی رو سے خزانہ سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ (چیک)

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا   ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی   رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے
نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فُروع کو   خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی   سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے   تکلّف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟   مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبُوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم   کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ   مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خُوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے   لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں   خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دَورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا   یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد (۱۴۳)   زنہار نہ ہونا طرَف اِن بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(۱۴۳) فرماتے ہیں (طرف ہونا۔ مقابلہ کرنا) اے زاہد میکدہ کے ہوشیار رندوں کے منہ نہ لگنا ان کو وعظ و نصیحت نہ کرنا۔ یہ بڑے گستاخ اور بے ادب ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تیری بے عزتی کر دیں۔ یہ وعظ و نصیحت کی تاب ہرگز نہ لائیں گے۔

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا — سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو (۲) وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا (۳) وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی (۴) فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کُھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب؟ (۵) قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے — ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گُل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

(۲) احباب میری بے چینی اور انتہائی شوقِ دیدار کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے غالبؔ ہم تیری بے تابی کا ذکر تیرے محبوب سے ضرور کر دیں گے لیکن ہم اس کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ تجھے اپنے پاس ضرور بلا لیں۔

پہلے مصرع میں شوقِ دیدار اور دوسرے مصرع میں محبوب کے غرور کی کیفیت ہے۔ مرزا صاحب اپنے دوستوں سے کہتے ہیں میری حالتِ زار ان کو سنا دو۔ شاید رحم کھا کر وہ مجھے اپنے پاس بلا لیں۔ احباب جواب دیتے ہیں کہ ہم تمہاری پریشان حالی کا ذکر تو ضرور کر دیں گے لیکن وہ اتنے مغرور ہیں کہ شاید کوئی پروا نہ کریں اس لیے ہم اس کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ تمہیں اپنے پاس بلا لیں گے۔

(۳) میرے دل کے اندر رکھا ہی کیا تھا کہ جو تیرا غمِ عشق اس کو غارت کرتا۔ ہاں ایک حسرتِ تعمیر تھی (تجھ سے ملاقات کی آرزو تھی) وہ ابھی تک محفوظ ہے برباد نہیں ہوئی۔

(۴) دُنیا کے غم و الم سے اگر سر اٹھانے کی فرصت ملتی بھی ہے تو آسمان کو دیکھ کر اس کے جور پیشہ ہونے کی وجہ سے تو یاد آ جاتا ہے تیرے یاد آنے سے پھر غم و الم میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مختصر یہ کہ کسی حالت میں بھی غم سے نجات نہیں ملتی۔

(۵) قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی۔

اس مصرعے سے دو مفہوم نکلتے ہیں:

(۱) اس نے یہ قسم کھائی ہے کہ جو بھی میرا خط ہوگا اسے جلا دے گا (۲) دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بعض خط ایسی روشنائی سے لکھے جاتے ہیں کہ جب کاغذ کو آگ میں جلایا جائے تو حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے پڑھ لیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ محبوب نے قسم کھائی ہے کہ وہ میرے خط کو جلائے گا ہی نہیں تاکہ اس کا مضمون پڑھ کر میرے سوزِ غم سے آشنا نہ ہو جائے۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا   ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
ہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب   بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی   دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے (۵)   میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے   جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے   پرتوے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے
حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ   غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا   آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے؟
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟   بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں   فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا (۱۲)   کس سے کہوں کہ "داغ جگر کا نشان ہے"
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر   غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

(۵) فرماتے ہیں اس شمع کی مانند ہوں جسے پوری طرح جلنے سے پیشتر ہی کسی نے بجھا دیا ہو۔ اس لیے میں جلے ہوؤں میں ایک داغِ ناتمامی ہوں اس پر مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں پوری طرح جل بھی نہ سکا ایک شعر اسی مفہوم کا اور فرمایا ہے

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے   اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

(۱۲) کثرتِ غم نے میرے جگر کو بالکل مٹا دیا ہے۔ اب جگر کی جگہ صرف ایک داغ باقی ہے اگر میں کسی سے یہ کہوں کہ یہ داغ میرے جگر کا نشان ہے تو اسے کون تسلیم کرے گا۔ گویا کثرتِ غم نے میری ہستی کے اعتبار کو بھی ختم کر دیا ہے۔

دردسے میرے، ہے تجھ کو بیقراری، ہائے ہائے (۱) کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری، ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری، ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری، ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری، ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری، ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبّت مل گئی اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری، ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟ ہے، نظر خو کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال ایک دل تِس پر یہ نا اُمّیدواری، ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ (۱۲) رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سُرورِ تبِ غم کہاں تلک ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

(۱) یہ غزل نہیں بلکہ مرثیہ ہے۔ (۱۲) ابھی میرے عشق نے وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا۔ یعنی چاک دامانی اور دشت نوردی کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ میرا محبوب اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہائے ہائے جنونِ عشق کا سارا جذبہ اور ذوقِ رسوائی جو کچھ دل میں تھا وہ دل ہی میں رہ گیا۔

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا ہرچند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ (۳) مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے (۴) خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سُناؤں حسرتِ اظہار کا گِلہ؟ دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز، اے خدا رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی اے شوقِ مُنفعِل، یہ تجھے کیا خیال ہے؟
مُشکیں لباسِ کعبہ علیؓ کے قدم سے جان (۸) نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق، تنگ تھا دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

(۳) اے اسد ہر ایک مکان کو اپنے مکین سے شرف ہوتا ہے مجنوں کا گھر جنگل تھا جو اُسی کے دم قدم سے آباد تھا اب وہ مر گیا ہے تو جنگل سونا پڑا ہے یعنی جنگل کی ساری رونق مجنوں کے مرنے سے ختم ہو گئی ۔

(۴) کلام کے عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے، کہ لوگ میری فہم کو نہیں پہنچتے میری خامشی باعثِ مسرت ہے ۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

(۸) مشکیں لباسِ کعبہ۔ کعبہ کا سیاہ خوشبو دار غلاف۔ نافِ غزال۔ ایک خاص قسم کا ہرن جس کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے نافۂ غزال کہتے ہیں۔ نافِ زمین۔ زمین کا مرکز۔ حضرت علیؓ پیغمبرِ خدا کے داماد تھے اور اُن کے خلیفہ بھی۔ غالبؔ حضرت علیؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ کعبہ وسطِ زمین ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہی بات نہیں کہ وہ نافِ غزال بھی ہے حضرت علیؓ کی مہربانی سے کعبہ کے فیض کی خوشبو تمام دُنیا میں پھیل رہی ہے ۔

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو   حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر   نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا   ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں!   ہم نہیں جلتے نفَس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا   ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ   جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"   زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا   تجھ پہ کھُل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے (۹)   کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے   جسے کہتے ہیں نالہ وہ اِسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو   وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

---

(۹) مولانا مفتی صدرالدین آزردہ ایک دفعہ غالب کے مکان کے سامنے سے گزرے اس وقت ذرا عجلت میں تھے اس لیے انھوں نے غالب کے پاس ٹھہرنا نہ چاہا کہاروں سے تاکید کی کہ جلد چلو۔ کہار کاندھا بدلنے لگے مگر آزردہ صاحب نے ان کو کاندھا بھی نہ بدلنے دیا۔ غالب نے دُور سے یہ حالت دیکھ لی اور فوراً یہ شعر لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا ؎

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے   کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم! اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟
نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

رحم کر ظالم کہ کیا بُودِ چراغِ کُشتہ ہے نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے ہمیں ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

چشمِ خُوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تُو کہوے کہ دُودِ شعلہ آواز ہے
پیکرِ عُشّاق سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے
دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا (۷) یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو (۱۲) آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

(۷) فرشِ پا انداز۔ وہ فرش جو دہلیز پر بچھا دیا جاتا ہے اور اکثر سرخ بانات کا ہوتا ہے۔
مجنوں کی لہو رونے والی آنکھوں کا کمال تو دیکھیے کہ نجد کا تمام بیابان فرشِ پا انداز کی طرح گلزار بن گیا ہے۔

(۱۲) ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا۔ یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔
حضرت غالب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہو اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر اپنی ہستی غفلت ہی حاصل کرنا چاہیے۔ خودی مٹی جب ملی خدائی۔ حاصلِ کلام یہ کہ دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام   دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں   نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

بے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے   صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مُغنّیِ آتش نَفَس کو جی   جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خَیال   تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں   آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟   شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے   (۱) مگر اک شعر میں اندازِ رَسا رکھتے تھے
اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا   آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(۱) عرشی صاحب نے اپنے غلط نامے میں اس شعر سے پہلے دو شعر بہم پہنچائے ہیں جو ان کو حال ہی میں جناب حمید الدین نظامی بدایونی کے مملوکہ مخطوطے میں ملے ہیں۔ لہٰذا یہ دو شعر شامل کر دیے ہیں اگر یہ شعر مرزا غالب کے تسلیم کیے جائیں تو مرزا غالب نے ان تین اشعار میں اپنی ساری زندگی کی تلخی پیش کر دی ہے۔ مرزا صاحب کو شدید احساس تھا کہ ان کے سرمایۂ حیات یعنی شعر و ادب کا کوئی صحیح قدر داں نہیں ملا اور کسی نے اس کی حقیقت کو نہیں پہچانا۔ لہٰذا لکھ لکھ کر جمع کرتے رہے اور اسی میں زندگی بسر کر دی لیکن اگر رہا تو صرف اسی بات کا کہ ان کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پہلے دو شعروں نے تیسرے شعر کا صحیح مطلب سمجھنے میں پوری وضاحت کر دی ہے۔

اُس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اِشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
مَیں، اور جاؤں دَر سے ترے بِن صدا کیے
رکھتا پھروں ہُوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مَے (۳)
مدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہَوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر (۴)
حضرت بھی کل کہیں گے، کہ "ہم کیا کیا کیے؟"
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کِس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عَدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
صحبت میں غیر کی، نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالؔب! تمہیں کہو، کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا، کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
میناے مَے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پاے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے، کہ گیتی خراب ہے

---

(۳) خرقہ وسجادہ یعنی گودڑی و مصلّے، دونوں کو رہن رکھتے پھرتے ہیں۔ دوسرے موسم بہار بھی پیشِ نظر ہے۔ گو ناداری ہے پھر دونوں چیزوں سے ہی کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

(۴) حضرت خضر عمرِ جاوداں رکھتے ہیں طنز کیا گیا کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا۔ بے صرفہ ہی عمر گذار دی عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا!   جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟   مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے   قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے (۴)   میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے   آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟   گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے   دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ!   نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق   پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اُس کی بزم آرائیاں سن کر، دلِ رنجور یاں   مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا   رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!   کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے، اسدؔ   پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

---

(۴) حضرت غالبؔ نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے بھی رشک کر رہے ہیں۔
فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آجاتا ہے۔ لہٰذا میں اِس رشک کی
وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں
ایک اور شعر اسی مضمون کا ہے ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے (۱) تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

(۱) مرزا صاحب نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط اس حادثہ کے سلسلہ میں لکھا تھا جو رام پور سے واپسی پر مرادآباد میں دریا پار کرتے وقت پیش آیا تھا اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور شعر بھی کہا تھا "ان کو کیا علم کہ...." یہ الہامی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا تذکرہ ص ۱۹۱ پر آئے گا یہ مرزا صاحب کے خود نوشتہ خط کا عکس ہے۔

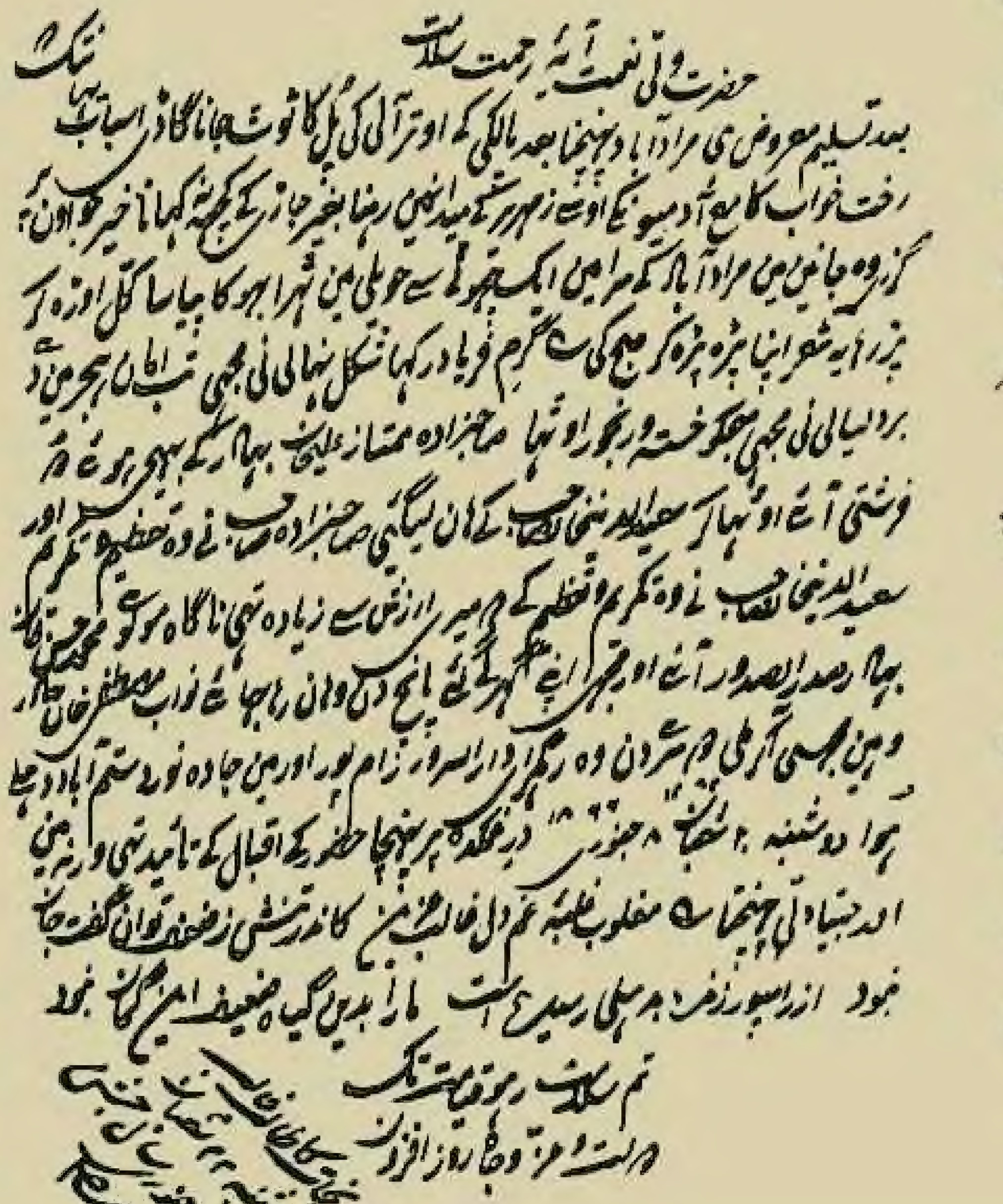

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے مرادآباد پہنچا جعدہ پالکی کہ اور آلکی کا ٹوٹ جانا گاڑی اسباب
رخت خواب کا بیچ آدمیوں کے اوس دن پہر تک میدان میں رہنا بغیر جاڑے کچھ نہ کھانا خیر گو ہوں
گزرے وہ جاڑے میں مرادآباد کے سرا میں ایک پہر رہ کے حویلی میں ٹھہرا ہوں کا جیسا کل اوڑھ کر
نذر ہے یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ہے گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی
برد لیالی نے مجھے جگر خستہ و رنجور ہوا تھا صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کہ میرے ہمراہ تھے غم
وسلی آئے اور مہاراج سعید الدین خاں صاحب سے کہا ان لیگئی صاحبزادہ صاحب نے وہ حضور اور
سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی جو میرے ارزش سے زیادہ تھی ناگاہ مولوی محمد حسن خاں
بہادر صدر الصدور آئے اور مجھ کو اپنے گھر لے گئے آج دن وہاں رہا جاتے نواب مصطفیٰ خاں بہادر
وہیں آپہنچے آج تیسرے دن وہ رہگزار دارالسرور رامپور اور میں جادہ نوردِ ستم آباد دہلی
ہوا دوشنبہ ۲ شعبان ۸۲ھ جنوری ۶۶ دہلی کہ پہنچا حضور کے اقبال کہ تائید تھی ورنہ میں
اور حیات اپنی سمجھا سے مغلوب طبیعت غم دل غالب کہ منع کانند زبیش زضعف توان گفت جا
نبود اندر سبوز نفس بہ ہیچ رسیدہ است ما از بدین گیاہ ضعیف این گمان نبود

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے (۱) برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم! (۲) باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

(۱) خط بنام عبد الرزاق شاکر میں یوں فرماتے ہیں: "شل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و ساماں ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت، داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج۔"

(۲) غنچہ تا شگفتن الخ "کلی جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول نہ بنے برگ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔ مصرع، برگ عیشی بگور خویش فرست۔ برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و ساماں ہے۔ خواب گل جمعیت گل باعتبار خوشی و برجا ماندگی، پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا، غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔"

ہم سے رنج بے تابی الخ پشت دست بصورت عجز اور خس بدنداں وکاہ: بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جب عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھدی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو۔ ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟ (عود ہندی)

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا، لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب، اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی!
ہر بُوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
حُورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن، اے ندیم
(۱۳) میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

(۱۳) قاضی عبد الجمیل
جنوں کو اس
شعر کی تشریح کے
متعلق کیا خوب
تحریر فرمایا ہے
ملاحظہ ہو۔

سے تجھ سا تو کچھ ہے یہ مطلب کہ آغاز چاہتا ہے یعنے شاعر کو ایک قاصد کے ذریعت
ہو سکے مگر کہتا ہے اے قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک [illegible] عاشق کا
ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے میں
ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کریگا خیر اور سے اب خط بھیجا گیا تھا را عاشق کا گمان
صحیح ہوا قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا گیا خط کیا جواب
دیوانہ بن کر پہاڑ جنگل کو چل دیا اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ
غیب دان تو خدا ہے کسے جانے کہ ایسا کیا خیر اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر
کہیں ملے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ صاحب تم کیا دیکھ کر عاشق ہو گئے ہی تو اور انجام
کار کیا ہوا (جواب کا طالب غالب) سے ام جون سنہ ٦٢

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے (۴)
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ (۵)
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام (۶)
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

(۴) مجنوں بریلوی کو اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے: "اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے۔"

(۵) نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو لکھتے ہیں: "یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہٖ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے ؎ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

(۶) میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: "وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے ؎ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام! ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
میاں! بارہ سو ستتر ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائیگا۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟
کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں   میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا   بُو بھی، اے چارہ گر! نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی (۵)   موت آتی ہے، پَر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے، غالبؔ!   شرم تم کو مگر نہیں آتی؟

* * *

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟   آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں (۹)   کاش پوچھو کہ "مُدعا کیا ہے؟"
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ق (۱۰)   پھر یہ ہنگامہ، اے خدا! کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

(۵) مرزا صاحب نے لطیف بلگرامی کو لکھا ہے۔ "فخرِ ایجاد و تکوین" مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالبؔ نیم مردہ نیم جاں رہ جائے ع مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی الخ۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی الخ اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے غیرت چاہتا۔ اسّی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں" جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد" الخ "کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ" (الخ)

(۹) میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھا ؎

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

ماجرا یہ ہے، کہ تمہارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا میں جس کا جواب لکھتا۔"

(۱۰) یہاں سے چند اشعار قطعہ بند ہیں: اے خدا! جب کہ ساری دنیا میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کسی شے میں اور کوئی موجود یعنی پنہاں نہیں ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے یعنی یہ دیر و حرم، ناقوس و اذان، انجمن و زنار و کلیسا و بتخانہ و من و تو کی بحث آرائی کیوں ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے ’وفا کیا ہے؟
"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا" اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے (۹) یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین (۱۰) ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت؟ دیکھا، کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

(۹) یہ غزل مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو روانہ کی تھی۔ فرماتے ہیں "جب میں حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ لکھی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل۔

(۱۰) بادۂ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے۔ اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے نکیرین "سوال جواب" کے لیے آتے ہیں۔ مرزا صاحب شوخی کے انداز میں فرماتے ہیں۔

"نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو۔ فرشتے قبر میں شراب کی بُو سے بھاگ جائیں گے اور میں سوال و جواب کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔"

کیا خوب اندازِ بیان ہے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں   اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر   اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ!   ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رُسوائی   دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہ ہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز   ق   گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال   ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب   اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ   کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی   نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی؟   ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے   شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی   مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے (۵)   اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا   ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت!   کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!   مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے   جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے   اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے (۱۱)   یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

(۵) ریشگی: یعنی خلش۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ کی فصد کھولی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ مجنوں کے رگِ بازو سے خون جاری ہو گیا۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(۱۱) اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے مجروح کو یوں لکھا ہے: "پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے۔ قد اس کا کتنا لمبا ہے، ہاتھ پاؤں کیسے ہیں، رنگ کیسا ہے۔ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں یہ ایک اعتبارِ محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے یعنی کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے۔"

سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر؟ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیِ خُو جس کے بیم سے اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق جو پانو اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی؟ کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا "کہ مرے عدو کو یارب، ملے میری زندگانی"

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے (۱) اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

---

(۱) مرزا صاحب نے شاگرد کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ع "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا۔ ظلمت غلیظ، سحر ناپیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیلِ صبح کی نمود ہے یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ بس دیکھا چاہیے۔ جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔"

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست — بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! ق — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں — نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں (۱۰) — غالب! صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے
آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ، بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گُل، آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب؟ — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰) نوائے سروش: فرشتے کی آواز۔ فرماتے ہیں: میرے خیال میں جو اچھے اور بلند مضامین آتے ہیں وہ غیب کی طرف سے آتے ہیں اور میرے قلم سے لکھتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ قلم کی نہیں بلکہ فرشتۂ غیبی کی آواز ہوتی ہے ورنہ انسان کو ایسے دقیق اور بلند مضامین نہیں سوجھ سکتے اگر غیبی مدد نہ ہو

ہجومِ غم سے یاں تک سر نگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو، مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایے کی طرح ساتھ پھریں، سرو و صنوبر
تُو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو، گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے؟
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے، دلِ ناداں
جب اک نفَس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر مَعرِضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچّھا ہے   اُس سے میرا مہِ خُورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ   جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"
اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا   ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال، اچھا ہے
بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جس کو نہ ہو خُوئے سوال، اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے، پاتے ہیں عشّاق بُتوں سے کیا فیض!   اک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو، شیریں سے کیا   جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے   کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضرِ سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز   شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال، اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن   دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی   امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ الَمِ حسرتِ دیدار تو ہے   شوق، گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی
مَے پرستاں خُمِ مَے مُنہ سے لگائے ہی بنے   ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی
نَفَسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا (۵۳)   گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو   نہ ہوئی غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

(۵۳) لیلیٰ کا رنگ سیاہ تھا اور وہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔ اس لیے لیلیٰ کے گھر کو سیاہ خانہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں قیس کی رُوح صحرا کے لیے تو چشم و چراغ ہے اگر وہ سیاہ خانۂ لیلیٰ یعنی لیلیٰ کے سیاہ خیمے کی شمع نہیں تو نہ سہی۔

عجب نشاط سے جلّاد کے، چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سایے سے سر، پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا، خرابِ بادۂ اُلفت
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی، نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے
خدا کے واسطے، داد اِس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے، ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، ہم نے
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم، آگے
دل و جگر میں پَر افشاں، جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اِس کو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے، سرگرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا، پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
(ق)
خامہ میرا، کہ وہ ہے باربَدِ بزمِ سخن (۱۵)
شاہ کی مدح میں، یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر عَلَم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے؟

(۱۵) باربد خسرو پرویز کے دربار کا ایک مشہور موسیقار تھا۔ میرا قلم بادشاہ کی مدح میں باربد کی طرح نغمہ سرائی کرتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے   تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال   آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں   یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" (۵)   تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا   کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے   وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن   ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار   یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہیے، کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

(۵) یہ غزل تفتہ نے مرزا صاحب سے مانگی انہوں نے غزل بھیج کر تفتہ کو لکھا "اگر ہم فقیر تکیے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ نیز یہ غزل شیو نرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔

"یہ تمہارا اقبال ہے کہ نو شعر یاد آگئے، ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو آیا چاہتی ہیں تین ہفتہ کا گودام تمہارے پاس فراہم ہوگیا"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیو نرائن اپنے ہفتہ وار اخبار میں مرزا صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن حضرت ذوقؔ پالکی میں جا رہے تھے کہ غالب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ چونکہ دونوں میں ہمعصرانہ چشمک تھی۔ لہٰذا مرزا نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا۔ ذوقؔ نے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے شکایت کی۔ غالب جب دربار میں گئے، بادشاہ نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ مرزا صاحب نے یہ پوری غزل سنا دی اور مقطع کا یہ مصرع بدل دیا "ہوا ہے شہ کا مصاحب . . . "

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ‏ ‏ ‏ چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو ‏ ‏ ‏ کاش کے تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ‏ ‏ ‏ دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب! ‏ ‏ ‏ کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ‏ ‏ ‏ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ‏ ‏ ‏ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ‏ ‏ ‏ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ‏ ‏ ‏ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر ‏ ‏ ‏ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر ‏ ‏ ‏ دیکھیے کب دن پھریں حمام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا (۱) ‏ ‏ ‏ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(۱) مرزا تفتہ کو لکھا ہے: "بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ ضعف نے غالب نکما کر دیا!"

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا فرماتے ہیں: "بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں سچ اگر پوچھیے تو نیم جان ہوں" "ضعف نے غالب نکما کر دیا۔" ریاض الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا "عشق نے غالب نکما کر دیا" تو فرمایا "بھائی، چپ رہو۔ یوں کہو "ضعف نے غالب نکما کر دیا۔" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا۔" عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔"

مولوی احمد حسن قنوجی کو لکھا "یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعاگو ہے۔ عشق نے غالب ... پینسٹھ برس کی عمر ہوئی! اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ جو مجھے آپ دیکھ گئے ہیں۔ میں اب وہ نہیں ہوں!"

پھر اِس انداز سے بہار آئی   کہ ہوے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک!   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر   رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا رُوے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہَوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے، بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی، غالبؔ   شاہِ دیندار نے شفا پائی

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے   اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالَم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سُبو، میخانہ خالی ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری   اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پُوچھ   دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟   مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زِ خود رفتۂ بیدائے خیال   بُھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مُقابِل میرا (۱۴)   رُک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری

(۱۴) عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے: "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہومِ شعر یہ کہ ہم اور دوست از روئے خوے و عادت ضدِ ہمدگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں   صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا   کھُل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ   ننگِ پیری ہے، جوانی میری

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی، مانگے
تو وہ بدخُو کہ تحیّر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ، کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تبِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع   شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

گُلشن کو تری صحبت، ازبسکہ خوش آئی ہے   ہر غنچے کا گُل ہونا، آغوش کُشائی ہے
واں کُنگرِ استغنا، ہردم ہے بلندی پر   یاں نالے کو اور اُلٹا، دعوائے رسائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم، ضبط کے اندازے   جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر   (۱) دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟   یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو   خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ   حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی

(۱) آنکھوں سے روتے روتے تمام خون خشک ہوگیا۔ دوست کے سر انگشت کی سرخی کو لہو تصور کیا یعنی دل میں ایک بوند لہو کی نظر تو آتی ہے۔ انگلی کے پور کو لہو کی بوند سے جو تشبیہ دی ہے وہ نہایت بلیغ و بدیع ہے۔

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم حیراں کیے ہوئے ہیں، دلِ بے قرار کے
آغوشِ گُل، کشودہ برائے وداع ہے اے عندلیب، چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں شوقِ فضول و جُراَتِ رندانہ چاہیے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب، بے ایامِ گُل کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے، بیگانگی مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو کِس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید (۱۱۲) نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل، اِن مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

---

(۱۱۲) مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو ۱۰ رجنوری ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھا "کیا کروں؟ سخت غمزدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

یہ شعر یوسف مرزا کو بھی ایک خط میں لکھا ہے۔ علاوہ ازیں چودھری عبدالغفور کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے: "حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب یہ باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رو دیا کروں گا، دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مرونگا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشین ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے، ہیہات۔ ؎ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ؛ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!
پُر ہے سایے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے (١)
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟
مَیں بُلاتا تو ہوں اس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے کہ ”یہ کیا ہے؟“ تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا!
ہاتھ آویں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

(١) وہ شوخ اس قدر نکتہ چیں ہے کہ غمِ دل اس کو سنایا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ وہ بات بات میں لفظ لفظ پر گرفت کرے گا اور کسی صورت بات بنتی نظر نہیں آئے گی۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے (۲) تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش، اگر وحشت، بہ عُریانی کرے صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب، کب تلک آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے!
میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست موئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو اُلفت نے عہد یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

(۲) اس شعر کی تشریح مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے: "بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آپڑے ہیں کہ وہ بطریقِ طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں۔ موت کی راہ نہ دیکھوں کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بِن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں ہے یہ بات ہے۔ ایک دن آئے ہی گی انتظار ضائع نہ جائے گا۔ تم کو چاہوں؟ کیا خوب، کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے، یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے۔ اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بِن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔"

یہ غزل مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے

"کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ارسال کی تھی۔

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — وے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا (۲) تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو — نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی! جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے (۵) کہا جو اُس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے (۶) مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے — دلِ بے دست و پا اُفتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو — فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی — شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بُو، بالش سے، اُسکی زلفِ مشکیں کی — ہماری دید کو، خوابِ زُلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ — کہ بے تابی سے، ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

---

(۲) اس غزل کے بارے میں مرزا علاء الدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا "پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خان مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ پلادے اوک سے ساقی . . . الخ۔ ے" اسد خوشی . . . الخ" اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کرکے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے . . . . جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو؟"

(۵) مقطع کے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے۔ "مرزا صاحب ایک مرتبہ پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انہوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دیدیجیے۔" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں"۔ جب وہ پیر داب چکے تو اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پانو دابے میں نے تمہارے پیسے دابے۔"

(۶) میں اس قدر تڑپا ہوں کہ تارِ بستر خارِ بستر ہے گویا بستر کانٹوں کا فرش بنا ہوا ہے۔ بیقراری میں آسائش و آرام بھی کانٹے بن کر کھٹکتے ہیں۔

خطر ہے، رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جاوے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جاوے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل، سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تُونبے!
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شَے میں تُو ہے
پر تجھ سی کوئی شَے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے
کیوں رَدِّ قدح کرے ہے زاہدؔ
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تُو کیا ہے، اَے 'نہیں' ہے

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے
در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فرُوغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سُنے، نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں، چل، بیوفا، برائے خدا!
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ یعنی اُس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جاے گی وائے ناکامی، کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ، رُوئے یار یاد آیا، اسدؔ جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ [۲] ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟
یہ ضِد، کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟
رہے ہے یوں گہ و بے گہ، کہ کوئے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ، کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب کہ بِن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ پُرسشِ حال کہ یہ کہے، کہ سرِ رہگذر ہے، کیا کہیے"؟
تُمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے!
اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟ ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے؟ سِتم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں؟ لیکن سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

[۲] مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا کہ بھائی یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے، پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرع اور ریختے کا ایک مصرع طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا اس میں مصرع فارسی یہ تھا ـــ زیں تماشا گاہ گریاں می رود
ریختے کا مصرع یہ تھا ـــ "خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے" نظر ہے کیا کہیے۔ خبر ہے کیا کہیے۔
میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں پڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا لینا۔"
یہ غزل اور غزلوں کے ساتھ صفحہ ۱۲۶ - ۲۷ ر اپریل ۱۸۵۳ء دہلی اردو اخبار میں بھی چھپ چکی ہے۔

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے   کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی، مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں   مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے   جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی   لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا، کاشکے!   اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا   لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی، مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟   تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں! نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!   پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی، مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نو زندگی (۹)   میرزا یُوسف ہے، غالب! یُوسفِ ثانی مجھے

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب" مجھے   سُبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب، مجھے
ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ، دررہنِ سخن   تھا طلسمِ قُفلِ ابجد، خانۂ مکتب، مجھے
یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟   رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں؟   آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے   عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب، مجھے

(۹) مرزا یوسف علی خاں غالب کے حقیقی بھائی تھے۔ تیس برس تک دیوانے رہے غالب کو ان سے بہت محبت تھی۔ جب وہ صحت یاب ہوئے تو مرزا صاحب نے اس غزل کے مقطع میں ازراہِ محبت اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مرزا یوسف نے دوبارہ زندگی پائی تھی اس لیے غالب نے اپنے بھائی کو یوسفِ ثانی کہا۔

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر (۳)
ابھی اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟
اُسے یُوسف کی بُوے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سُبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں، شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے؟
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں، گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؛
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طُولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

---

(۳)، فرماتے ہیں۔ ابھی تو لوگ بے چارے فرہاد کی طاقتِ جسمانی کا امتحان لے رہے ہیں۔ یعنی اس سے پہاڑ کاٹ کر "جوئے شیر" لانے کی آزمائش کر رہے ہیں۔ ایک دن یہی لوگ فرہاد کے حوصلے کا بھی امتحان لیں گے کہ یہ کہاں تک رنج و الم برداشت کر سکتا ہے۔

تکلف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی لیکن (۱)
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے، کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیوں کہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی وَرطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز، سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گُل، قیامت ہے

لاغر اتنا ہوں، کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے (۸)
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے جو اُس کو دیکھ کر آجائے رحم؟
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
مُنہ نہ دِکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دِکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ مَیں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

(۱) فرماتے ہیں: میں بے شک اس کو دیکھتا ہوں لیکن رشک کی وجہ سے مجھے یہ ظلم بھی گوارا نہیں کہ میں اُسے دیکھوں۔ اسی مفہوم کا اور غزل میں بھی ایک شعر کہا ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۸) مرزا غالب نے لاغری کے مضمون کو خوب نظم کیا ہے۔ محبوب کے پاس جانے کی رسوائی کو باطل کیا۔ اس کے لیے عذر کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ ایسا ہی ایک شعر اور کہا ہے ؎ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ؛ یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ظفر بادشاہ نے بھی ایک شعر خوب کہا ہے ؎

ناتوانی نے بچا لی جان میری ہجر میں
کونے کونے ڈھونڈتی پھرتی قضا تھی میں نہ تھا

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں مرے نزدیک (۲) — اک بات ہے، اعجازِ مسیحا مرے آگے
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں، ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں، صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟ — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا — کیوں کر کہوں "لو نام نہ ان کا مرے آگے"

(۲) اورنگِ سلیماں: حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت۔ حضرت سلیمانؑ ایک پیمبر گزرے ہیں۔ ان کی بادشاہت بنی نوع انسان پر ہی نہ تھی بلکہ چرند پرند اور جنوں پر بھی ان کی حکومت تھی اور جنوں کی مدد سے ان کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا

اعجازِ مسیحا: عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک پیغمبر تھے۔ ان کے معجزے اور کمالات بہت مشہور ہیں۔ ان کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی پھونک سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

سلیمان کا تخت میرے نزدیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ کا معجزہ میرے آگے ایک معمولی سی بات ہے یعنی شاہانہ شوکت اور پیغمبرانہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس غزل کے متعلق منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔ دریا مرے آگے، صحرا مرے آگے۔ اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے قلعۂ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ چھپی ہے۔

"منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوانِ خاص میں مجتمع ہوئے حضور اقدسِ اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جنابِ حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شہزادگان والاتبار بعد باریابیِ مجراحسب الحکم قضا توام شرفِ نشست سے حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر (۱) کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قُلزُمِ خوں، کاش یہی ہو (۲) آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جُنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا غالبؔ کو بُرا کیوں کہو؟ اچھا مرے آگے!

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مُدعا کہیے" تمہیں کہو، کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دل کُشا کہیے
جو مُدعی بنے، اُس کے نہ مُدعی بنیے جو نا سزا کہے، اُس کو نہ نا سزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

(۱) کلیسا: گرجا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہوں، ایمان اور کفر دونوں مجھے اپنی اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اگر ایک طرف کلیسا مجھے اپنی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف کعبہ ادھر جانے سے منع کرتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

(۲) مجروحؔ کو ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے "میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا، کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے   کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت، نہ ہو نگار تو ہے   روانیِ رَوِشِ و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے   طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ (۴)   خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے   دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مےکشی   تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے، تم   بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟   پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش   دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نشّہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب   شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"   واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

(۴) یہ غزل بھی مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیرؔ کو اس غزل کے ساتھ ارسال کی تھی جس کا مطلع ہے ؎

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے

اور قلعہ کے کسی مشاعرے کی ہے جیسا کہ مرزا غالب نے ایک جگہ لکھا ہے "میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دو مصرع ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔" یہ تینوں غزلیں مرزا نے حقیرؔ کو بھیجیں۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے   دعویٔ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل   یک جہاں زانو تامّل، در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام   ورنہ دنداں در دل افشردن، بنائے خندہ ہے
شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں   بس محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے   آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟   چشمِ وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے، سر بسر   کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی؟
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات   ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے، اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے   آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی   کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی؟
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گل   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی؟
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز   تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست   نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزمائے عمر   فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی؟
ہے، وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز   یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی (۱) میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی (۶) نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی (۷) بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟ کس کی حاجت روا کرے کوئی؟
کیا کیا خضر نے سکندر سے (۹) اب کسے رہنما کرے کوئی؟
جب توقع ہی اُٹھ گئی، غالب کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

(۱) مریم کے بیٹے۔ حضرتِ عیسیٰ جو بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے: فرماتے ہیں کوئی ابنِ مریم (مسیحا) ہے تو ہوا کرے مجھے کیا؟ میں تو تب جانوں کہ میرے دُکھ درد کی کوئی دوا کرے

لیعنی میں محبت کا بیمار ہوں مجھے اگر مسیحا اچھا کر دے تب میں سمجھوں کہ کوئی واقعی ابنِ مریم (مسیحا) ہے۔ مدعا یہ کہ مرضِ عشق لاعلاج ہے۔

(۶، ۷) کیسے خوبصورت اور سادہ الفاظ میں یہ اخلاقی شعر بہم پہنچائے ہیں مصرعوں کی بندش کتنی حسین ہے۔

(۹) خضر و سکندر کا قصہ مشہور ہے۔ خضر علیہ السلام سکندر بادشاہ کو آبِ حیات کے چشمے پر لے گئے۔ خود تو آبِ حیات پی لیا اور سکندر کو اُن لوگوں کے سامنے لے گئے جو آبِ حیات پی کر بوجہ طول العمری ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھانچ بن کر رہ گئے تھے۔ سکندر نے یہ عالم دیکھ کر آبِ حیات پینے سے انکار کر دیا۔ یہی تلمیح اس شعر میں ہے۔

فرماتے ہیں خضر نے سکندر سے کیا کیا، یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا خضر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کوئی اب کسے رہنما بنائے۔

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے (۱)   غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے   تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے
کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے   کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود   کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا   خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دیدِ گراں مایہ شرط ہے ہمدم   وگرنہ مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی   یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے   سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم!   ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے   آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک   آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے   دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی   اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی؟
جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ   لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے   کیونکر نہ کھائیے! کہ ہوا ہے بہار کی

---

(۱) اس غزل کا مطلع اور مقطع مرزا صاحب نے مہر کے خط میں تحریر کیا ہے۔ نیز اس کے بارے میں علائی کو یوں لکھا ہے:۔
"تم نے اشعارِ جدید مانگے۔ خاطر تمہاری عزیز، ایک مطلع، صرف دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے، یاد آگئے کہ وہ داخلِ دیوان بھی نہیں۔ ان پر فکر کر کے، ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر، سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔" عرشی صاحب اور لالہ مالک رام نے اپنے مرتبہ نسخوں میں اس غزل کے تین شعر مروجہ دیوان میں اور چار شعر "تتمہ" میں شامل کیے ہیں جبکہ غالب کی تحریر کے بموجب غزل ہذا کا کوئی شعر دیوان میں نہیں ہے اور مولانا عرشی نے غالب کے ایک ہی خط بنام نواب علائی کو دونوں جگہ نقل کیا ہے۔ لہذا پوری غزل ایک ہی جگہ درج کر دی گئی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر   وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے!
نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں، لیکن (۲)   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کُھل جائے ظالم! تیرے قامت کی درازی کا   اگر اس طرّۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے   ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی   پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی   وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
مَحبّت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا   اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ!   پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر اگر صدا ہو جائیے   بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے؟
بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس   از سرِ نو زندگی ہو، گر رِہا ہو جائیے

(۲) آدم کا خلد سے نکلنا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت میں رہنے کے لیے حکم دیا اور وہاں وہ بڑے آرام سے رہتے تھے۔ ابلیس ان کے اس آرام کو دیکھ کر جل گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرح اس پتلۂ خاکی کو جس کی وجہ سے میں راندۂ درگاہ ہوا تھا جنت سے نکلوا دوں

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ تم جنت میں گیہوں کے دانے مت کھانا۔ شیطان نے آدم کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کیا کہ اس دانہ کے کھانے سے تمہاری عزت اور توقیر زیادہ ہو جائے گی اسے کھا لو۔ غرضکہ شیطان کے بہکانے سے آدم علیہ السلام نے دانۂ گندم کھا لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ خدا کا حکم پہنچا تم نے ہمارے حکم کی نافرمانی کی۔ اب تم جنت میں نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں: "آدم کا جنت سے نکلنا تو سنتے آئے تھے۔ مگر ہم اس سے بھی زیادہ بے آبرو ہو کر (اے محبوب) تیرے کوچے سے نکلے ہیں۔" کوچۂ یار کو کس خوبی سے بہشت کہا ہے

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے   موجِ شراب یک مژۂ خواب ناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو   جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ   صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی (۱۳)   قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے   نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟   شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر   مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے   خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں   نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی   کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے (۱۴)   کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو   چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

(۱۳) حضرت عیسیٰ کی زبان اور لب میں یہ تاثیر تھی کہ ایک جنبشِ لب ہی مردوں کو زندہ کر دیتی تھی۔ فرماتے ہیں حسینوں کے کشتگانِ لبِ لعلیں پر عیسیٰ کے لبوں کی جنبش کا جادو نہیں چلتا ہے۔ بلکہ لبِ عیسیٰ کی جنبش اُن کے حق میں لوری اور پالنے کی حرکت جیسا کام کرتی ہے یعنی کشتگانِ حسن کی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

(۱۴) ساقی سے رضامندی چاہتا ہے تو دل اور دین شراب کی قیمت میں پیش کر۔ ادھار سے کام نہیں چلے گا۔ صرف دل یا صرف دین سے قیمت پوری نہ ہو گی۔ مرزا صاحب نے ایک ایسا شعر اور کہا ہے۔ "رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے، مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے"

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے   نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم   صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ   کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ دماغِ آہوے دشتِ تتار ہے
کس کا سُراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا   آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جائے غبارِ شوق   گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مُدّعی و دیدہ بنا مُدّعا علیہ   نظّارے کا مُقدّمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب   اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے   وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر   ہر ذرّے کے نقاب میں، دل بیقرار ہے
اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں   طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی   اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط   (۱۳) اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

---

(۱۳) اس مقطع کا دوسرا مصرع مرزا صاحب نے مرزا تفتہ کے خط میں یہ کہہ کر نقل کیا ہے کہ "میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا مگر ہاں، اپنے ہندی کلام سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے؟   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں   گلدستۂ نگاہ، سُوَیدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا!   افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے   وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں   شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گُلہائے عیش کو   صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے
غالبؔ بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے ،،   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

شبنم بہ گُلِ لالہ، نہ خالی ز ادا ہے   داغِ دلِ بے درد، نظرگاہِ حیا ہے
دل خُوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار   آئینہ بہ دستِ بُتِ بدمست حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی   جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے!
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق   آئینہ بہ اندازِ گُل آغوش کُشا ہے
قُمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ   اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو   معشوقی و بے حوصلگی، طُرفہ بلا ہے

،، مرزا صاحب سیف الحق سیّاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں : " بھائی سیف الحق تمہارا خط پہنچا قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو اگر کوئی وجہ اپنے پر اُن کے عتاب کی پاتا تو اُن سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا جب سببِ ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں تم بُرا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اُس کو خدا کے حوالے کرو.

غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت   دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ   تیغِ ستم آئینۂ تصویر نُما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی   سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ   کوئی نہیں تیرا تو مری جان خُدا ہے
منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نُور کی   قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہُور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں   پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی
واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو (۸)   کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہُور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا؟   گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج   اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں (۱۱)   کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟   آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر   کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں (۱۴)   حج کا ثواب نذر کروں گا حضُور کی

(۸) شرابِ طہور۔ پاک شراب۔ پینے کی پاک چیز۔ شرابِ طہور۔ یہ نہایت لذیذ اور خنک شربت ہوگا جو جنت میں رہنے والوں کو پلایا جائیگا۔ ازراہِ شوخی فرماتے ہیں: "اے واعظو، تمہاری شرابِ طہور کے کیا کہنے جس کو نہ تم خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو صرف باتیں اس کی تعریف کرتے ہو۔"

(۱۱) واں سے مراد خانۂ کعبہ۔ اگرچہ اس وقت خانۂ کعبہ میں کوئی بُت موجود نہیں لیکن یہ بُت وہاں سے نکالے ہوئے تو ہیں اس لیے ان کو خانۂ کعبہ سے دور کی نسبت ضرور ہے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں جو بُت پرستی کرتا ہوں تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے یہی بت کسی زمانے میں کعبہ کی زیب و زینت تھے مگر وہاں سے نکالے گئے تو کیا ہوا ان کو خانۂ کعبہ سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے

(۱۴) یہ غزل اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب شاہ ظفر نے حج کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ ریذیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی۔ مرزا غالب نے ہمراہ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے۔ غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں ؎ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام بہت ہے   یہ رنج، کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ   ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے
کیا زُہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟   پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے! (۶)   آلودہ بمے، جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو   انکار نہیں، اور مجھے اِبرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ!   رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟   شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر، جگرِ لخت لخت کو   عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم   برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس   مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

(۶) جامۂ احرام۔ حاجی لوگ عرب کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر حج کا ایک خاص لباس پہنتے ہیں۔ یہ ایک سفید کپڑا ہوتا ہے اس کو تہمد کے طور پر باندھتے ہیں اور اسی کا ایک حصہ جسم پر اوڑھ لیتے ہیں۔ حج کے موقع پر دنیا کے تمام حاجی ایک لباس میں ہوتے ہیں۔ اسی لباس کو جامۂ احرام کہا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں: میرا جامۂ احرام شراب سے آلودہ ہو کر ناپاک ہو گیا ہے۔ اس لیے اس ناپاک لباس کے ساتھ مجھے حرم کے طواف سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مجھے تو چاہِ زمزم پر ہی چھوڑ دو تاکہ میں اس مقدس پانی سے شراب کے دھبوں کو دھو ڈالوں

اس قسم کا ایک شعر اور بھی کہا ہے ؎ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ؛ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل   سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب   نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے (۴)   پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب   عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال   صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا   جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو   سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں   سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن   بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے   بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لیے   رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے   رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اے خضر   نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی، میں مبتلائے آفتِ رشک   بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

---

(۴) میرے دل نے خودی و خودداری کی بنی بنائی عمارت کو گرا دیا ہے اور اب پھر کوئے ملامت یعنی کوچۂ دوست کی طرف جانے کا ارادہ کرلیا ہے جہاں مجھے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے (۴)
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے، پاسباں کے، لیے
بقدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے (۵)
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ، بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا! (۶)
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملت و ملک (۷)
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

---

(۴) اس شعر کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں: "اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروانہ تھے۔ آغاز مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

(۵ تا ۷) اس غزل کے یہ پانچ شعر نواب تجمل حسین خانصاحب کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ تجمل حسین خانصاحب فرخ آباد کے نواب تھے۔ انھوں نے مرزا غالب کے ساحرانہ کمال کی تعریف اور شہرت سن کر انھیں فرخ آباد آنے کی دعوت دی۔ لیکن حضرت غالب فرخ آباد کسی وجہ سے نہ جا سکے۔ یہ ریاست بنگش خاندان نے فرخ سیر کے عہد میں قایم کی تھی جو غدر کے زمانہ میں برباد ہو گئی۔

میرٹھ کے رئیس نواب اصغر علی خاں بہادر نے ایک مشاعرہ دہلی میں منعقد کرایا تھا اور اس زمین میں طرح دی گئی تھی حضرت غالب، ذوق اور مومن تینوں شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور تینوں باکمال شاعروں کی غزلوں کا موازنہ کیا ہے۔ یہ غزل اس مشاعرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی

قصائد

منقبت میں

سازِ یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ، سُویدائے بہار
مستیِ بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار
سبز ہے، جامِ زمرّد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت رُوئے شرار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سر نوشتِ دو جہاں ابر، بہ یک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے، ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
مے کدے میں ہو اگر آرزوے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
آج گل ڈھونڈھ، بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گُم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار
لعل سی کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ، کہ جس کی پے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلکُ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرَفا (۱)
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اُس دشت کی اُمید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے، بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے، ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز (۲)
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری، نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے، عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار
مُردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طربِ خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدہ تا دل، اسدؔ! آئینۂ یک پرتوِ شوق (۱۲)
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۱) نجف، عرب کی سرزمین کا ایک مقام ہے: فرماتے ہیں کہ عارف خاکِ نجف کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس خاک پر وہ چلتے وقت اپنے نقشِ قدم میں اپنے جاگے ہوئے نصیب کی صورت دیکھتے ہیں۔

(۲) مُہرِ نماز: شیعہ حضرات نماز پڑھتے وقت ایک مُہر، سجدے کی جگہ پر رکھ لیتے ہیں۔ اُسی کے اوپر سجدہ کرتے ہیں۔ اس مہر میں پنجتن پاک (حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے نام لکھے ہوتے ہیں۔

منقبت

دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں!

بے دلی ہاے تماشا کہ نہ عبرت ہے، نہ شوق
بے کسی ہاے تمنا کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینہ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزاے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینہ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہاے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آداب و وقار و تمکیں

نقشِ "لاحول" لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جاے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رُسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع، مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے، اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا؟
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں؟
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل، پر از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری، وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"
غمِ شبیر سے ہو سینہ، یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں، یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے، اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

ہاں، مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مَرحَبا! اے سُرورِ خاصِ خواص!
حَبّذا! اے نَشاطِ عامِ عوام
عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جاوے اور آوے شام
ایک مَیں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نَمّام؟
جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمیدگاہِ اَنام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا؟
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن مَیں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام؟
میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فَرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟
جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چُکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پَرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی رَوِش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بد نام؟
مَے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟   غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار   دل کو لینے میں جن کو تھا اِبرام
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے   کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زُہرہ و بَہرام
تُو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن   نامِ شاہنشہِ بُلَند مُقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ   مَظہرِ ذُوالجلالِ والاِکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول، معنیِ الہام
بزم میں، میزبانِ قیصر و جم (۱۴۲)   رزم میں اوستادِ رُستم و سام

---

(۱۴۲) قیصر و جم۔ قیصر روم کا جلیل القدر بادشاہ تھا اور جم ایران کے ایک بادشاہ کا نام ہے جو بڑا مہمان نواز تھا۔ بادشاہ ظفر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کی محفل میں قیصر و جم جیسے جلیل القدر بادشاہ اُس کے دسترخوان پہ کھانا کھاتے ہیں اور لڑائی کے میدان میں وہ فنِ سپاہ گری میں ایران کے مشہور پہلوانوں رستم اور سام کو طریقۂ جنگ سکھاتا ہے۔ رستم اور سام دنیا کے بڑے نامور پہلوان تھے۔ سام رستم کے دادا کا نام تھا

اے ترا لطف زندگی افزا!   اے ترا عہد فرخی فرجام!
چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ (۲)   لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم   جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے   ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے   گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک   ق   آفریں! آب داریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر، ہدف   تیغ کو تیری، تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند!   ق   برق کو دے رہا ہے کیا الزام!
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا   تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز   ق   گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے   کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے   صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا   مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کُش"   لکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں   گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں   خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"
آتش و آب و باد و خاک نے لی   وضع سوز و نم و رم و آرام

---

(۲) ایرج۔ تور۔ خسرو۔ بہرام۔ ایران کے کیانی بادشاہ تھے۔ گیو رستم کا داماد تھا۔ بیژن کی داستان شاہنامہ فردوسی میں مشہور ہے۔

(۳) گیو۔ گودرز۔ بیژن۔ رہام۔ یہ ایران کے مشہور پہلوان تھے۔ گیو۔ گودرز۔ بیژن۔ رہام۔ یہ سب تیرے بازو کی قوت کو تسلیم کرتے ہیں

مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز" (۱) ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی (۲) دی، بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز ہو ابد تک رسائیِ انجام!

صبحدم دروازۂ خاور کھُلا مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صَرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا!
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھُلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا
لا کے ساقی نے صَبوحی کے لیے رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا
تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھُلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھُلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا

(۱ - ۲) جس طرح آفتاب کا نام" دن کا بادشاہ" اور" چاند کا نام" شام کا کوتوال" تجویز کیا گیا تھا اسی کے مطابق تیرے نام پر فرمانِ سلطنت خدا کی طرف سے لکھ دی گئی ہے

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام   اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا
رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے   واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب   تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب   تو کہے بُت خانۂ آذر کھُلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے   منصبِ مہر و مہ و محوَر کھُلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک   میری حدِّ وسع سے باہر کھُلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید   کس نے کھولا؟ کب کھُلا؟ کیونکر کھُلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار   مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھُلا
ہو جہاں گرمِ غزلخوانی نَفَس   لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا
کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا   کاشکے ہوتا قفس کا در کھُلا!
ہم پکاریں اور کھُلے یوں کون جائے؛   یار کا دروازہ پاویں گر کھُلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ   دوست کا، ہے راز دشمن پر کھُلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ   زخم لیکن، داغ سے بہتر کھُلا
ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں؟   کب کمر سے غمزے کی خنجر کھُلا؟
مفت کا کس کو بُرا ہے، بدرقہ؟   رہروی میں، پردۂ رہبر کھُلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟   آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھُلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا
دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی   (۱۸) ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

(۱۸) مرزا غالب نے اپنے ولی ہونے کے متعلق پہلے بھی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے۔ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب الخ .. دونوں مقامات پر کیا شوخیانہ انداز اختیار کیا ہے۔ واقعی مرزا صاحب کسی ولی سے کم نہ تھے جیسا کہ ان کے اکثر اشعار الہامی کیفیت رکھتے ہیں

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال   پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے سے پائی طبیعت نے مدد   بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ   یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا   بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا؟
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب   اب، عُلُوِ پایۂ منبر کھلا؟
سکۂ شہ کا ہوا ہے رُوشناس   اب، عیارِ آبروے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ   اب، مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے (۸) اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے   دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پہ ستایش نا تمام   عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل   تم پہ، اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک (۱۲) ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفت انبہ

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز   کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامے کا صفحے پر رواں ہونا   شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے"؟   نکتہ ہاے خرد فزا لکھیے

(۸) طغرل اور سنجر، دھوکہ دے کر ملک کے وارث بن گئے تھے۔ جب بادشاہت شاہ ظفر کے قبضہ میں آئی تو معلوم ہوا طغرل و سنجر جو فریب دے کر بادشاہ بن گئے تھے وہ غلط تھے۔ ملک کے صحیح وارث شاہ ظفر ہی ہیں۔

(۱۲) صاحبقراں۔ وہ بادشاہ کہلاتا ہے جس کی ولادت کے وقت تین مبارک ستارے ایک برج میں جمع ہوں۔ امیر تیمور اور شاہجہاں صاحبقران بادشاہ تھے۔ یہ شعر دعائیہ ہے اور لفظ 'صاحبقران' بادشاہ کی کامیاب حکومت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے   خامۂ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟   ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟   آئے، یہ گوے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک   پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور   بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے   شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے؟   آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟
نہ گُل اس میں، نہ شاخ و برگ نہ بار   جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں؟   جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی (۱۰)   کوہ کن، باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان (۱۱)   پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر (ق)   کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام   شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہو گا کہ فرطِ رافت سے   باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ ربّ الناس   بھر کے بھیجے ہیں، سر بہ مُہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات   مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

---

۱۰ و ۱۱۔ شعار میں فرماتے ہیں جان میں اگر آم جیسی شیرینی ہوتی تو کوہکن باوجود انتہائی غمگین ہونے کے شیریں کے فراق میں اتنی آسانی سے ہرگز جان نہ دیتا۔ اگرچہ جان کے قربان کرنے میں وہ یکتائے زمانہ تھا۔ کوہکن شیریں کے مرنے کی خبر پاتے ہی تیشہ مار کر مر گیا مطلب یہ ہے کہ جان اتنی شیریں نہیں ہے جتنا کہ آم شیریں ہے۔ شیریں اور کوہکن کی رعایت کس خوبصورت انداز سے آئی ہے۔

تب ہوا ہے ثمرفشاں یہ نخل (۱) ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں نخل!
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ق رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا، اگر ایک بار پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ (۵) طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہِ جلال زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے خلق پر، وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو! اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو!

---

(۱) خسروِ ایران کے بادشاہ (کے پاس ایک کندن تھا جس کو دبا کر وہ جو چیز چاہے بنا سکتا تھا۔ اس نے ایک لیموں بنایا تھا جو اس کے دسترخوان کی زینت ہوتا تھا اور اس کے بعد کسریٰ نے سونے کا ساگ بنوایا، اسی سونے کو عرفاً طلائے دست افشار کہتے ہیں اگر خسروِ آم دیکھ لیتا تو دست افشار کو فوراً پھینک دیتا کیونکہ اس کا رنگ اگرچہ آم کی طرح زرد تھا مگر یہ خوشبو اور مٹھاس کہاں وہ آم ہی کو دسترخوان کی زینت بناتا۔

(۵) طوبیٰ بہشت کے ایک درخت کا نام ہے۔ خاص یہ کہ آم بھی بہشت کا میوہ ہے اور خلد کا توشہ ہے۔

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر   اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ   فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام   تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قُربِ کلیم   تجھ سے دنیا میں بچھا مائدہ بذلِ خلیل
بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنے و لفظ   بہ کرم، داغِ ناصیہ نہ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر   تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر   زُہرہ نے ترک کیا، حُوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین   تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید   تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا، کہ نہ دے مجھ کو اماں   چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ   پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم   کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی [۱۲]   غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر   کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف   جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
کعبۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر   کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۱۲) لقا مصر کے ایک فرعون کا نام تھا جو اپنی داڑھی کے بالوں میں موتی پرو کر رکھتا تھا۔ شعر گوئی کی قابلیت کے لحاظ سے میری تحریر لقا کی داڑھی کی موتیوں کی لڑی ہے۔ مگر افسوس کہ دنیا بھر کے تمام غم و اندوہ میرے سینے میں اسی طرح بھرے ہوئے ہیں جیسے عمرو عیار کا بچکول جو دنیا بھر کی چیزوں کو اپنے اندر بھر لیتا تھا۔

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے، پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں ”کیوں، ہم نہ کہتے تھے“

کلکتہ کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خودآرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ!
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خودآرا کہیے
مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مُشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حَجرُ الاَسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صَومَعے میں اسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قُفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے!
کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے؟
کیوں اسے مَردُمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اُسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے؟　　کیوں اُسے نقش پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض　　اور اِس چکنی سپاری کو سُویدا کہیے

نہ پُوچھ اس کی حقیقت حضُورِ والا نے　　مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خُلد سے باہر　　جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی!　　اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں!　　مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

(۱) نیز عرشی صاحب نے اس زمین میں مولوی علی بخش شرر کے پیچوان کی رسید لکھی ہے جس کے چند اشعار دیے جاتے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پیچواں حقہ عنایت جو کیا حضرت نے　　جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے اسے کیا کہیے
قبلۂ عرشِ معلّیٰ کے مشابہ لکھیے　　اور لطافت میں مہ و مہر سے مانا کہیے
آبِ حیواں کے یہ بھرنے کی صراحی ہے مگر　　حضرتِ خضر کی تسبیح کا شمسا کہیے
حقّے کو لکھیے اگر ماہِ شبِ چار دہم　　نیچے کو دیکھتے ہی چاند کا ہالا کہیے
سارے نیچے پہ جو ہے کام یہ زر دوزی کا　　کہکشاں سے بھی نہ کیوں رتبے میں اعلیٰ کہیے
آتشِ گُل سے جو اس نے چمکتی ہے چلم　　ساتھ موسیٰ کے ضیائے یدِ بیضا کہیے
دار کی شکل ہے نے حقہ کہے ہے حق حق　　شکل منصور نہ کیوں حقہ کا رتبا کہیے
دم میں دم آئے ہے جو شخص ہو اس کا ہمدم　　دم کو اس کے مگر انفاسِ مسیحا کہیے
گوشِ غلماں کا تو آویزہ یہ حقہ ہے شرر　　نیچے کو رشک دہ گیسوے حورا کہیے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں (۶) — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

بہ تقریب شادی شہزادہ جواں بخت، بادشاہ بیگم زینت محل کی فرمائش پر مرزا غالب نے جو سہرا لکھا تھا اس کے مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑی تھی وہ شاہ ظفر کو ناگوار گزری۔ خیال ہوا کہ یہ تو استاد ذوق پر چوٹ ہوئی ہے۔ اتفاقاً ذوق بھی آ گئے اور اُن سے کہا گیا کہ ایک سہرا آپ بھی لکھیں جس پر معاملہ نے طول پکڑا۔ مگر غالب موقع شناس تھے اور ان کا مسلک صلح کل تھا بقول خود سے آزاد رو ہوں۔۔ الخ لہٰذا یہ معذرت نامہ پیش کیا۔

---

(۶) مرزا غالب نے معذرت کا یہ شعر خط بنام نواب کلب علی خاں میں استعمال کیا تھا۔ یہ مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے۔ فوٹو ملاحظہ فرمائیں۔

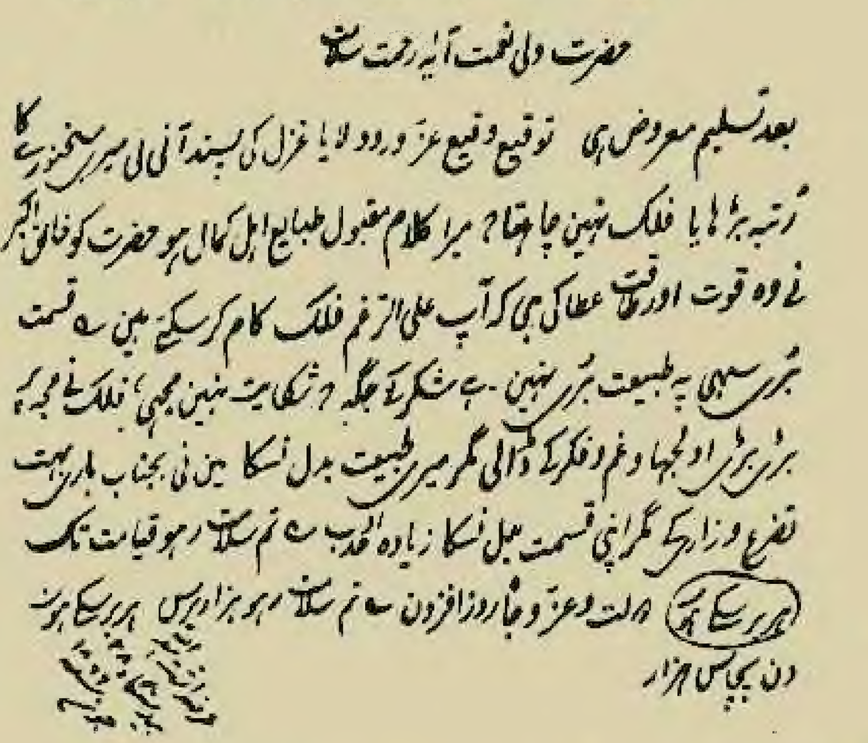

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے توقیع وقیع عز ورود لایا غزل کی پسند آنی میرے سخنور کا رتبہ بڑھایا فلک نہیں چاہتا؟ میرا کلام مقبول طبایع اہل کمال ہو حضرت کو خالق اکبر نے وہ قوت اور رفعت عطا کی ہے کہ آپ علی الرغم فلک کام کر سکتے ہیں سو قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے، فلک نے مجھ پر بڑی بڑی اوجھاو غم و فکر کے ڈالی مگر میری طبیعت بدل نہ سکا میں نے بجناب باری بہت تضرع و زاری کی مگر اپنی قسمت بدل نہ سکا زیادہ حد ادب ہے تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزوں ہے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے رح تجھ سے جو اتنی اِرادت ہے تو کس بات سے ہے؟
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور مَیں وہ ہُوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست نسبت اک گُونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عِناں یہ دُعا شام و سَحَر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اِس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

در مدح شاہ

ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو! (۸) رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشک بُو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست (۹) سبزے کو رَوندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ (۱۰) بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے رُوپیلے کے چھلّے حضور میں (۱۱) ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے (۱۲) لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

(۸) اس قطعہ میں جس رسم کی طرف اشارہ ہے اُس کی اصل یہ ہے کہ ماہِ صفر کے آخر چہار شنبہ کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم مجرم صحت تھے اس دن خوشی منائی جاتی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں: "آج ماہِ صفر کا آخری چہار شنبہ ہے چلو ہم بھی چمن میں مئے مشکبو کی ناند بھر کر رکھدیں تاکہ اپنے احباب کے ساتھ خوشی منائیں:
آج کے دن احباب سبزہ روندنے کے لیے چمن میں آئیں گے گلگشتِ باغ کے ساتھ مے نوشی کا بھی لطف رہے گا۔

(۹) تاکہ جو باغ میں آئے وہ شراب کے جام پیے۔ اور مے پرستی کے عالم میں سبزے کو روندتا پھرے اور پھولوں کے پودوں کو پھاند جائے۔

(۱۰) غالب اب مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا اور دوسری بات کوئی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

(۱۱) آج بادشاہ کے محل میں سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہو رہے ہیں ان چھلوں کی چمک دمک کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی ماند ہے۔

(۱۲) سونے کے چھلّوں کو آفتاب سے اور چاندی کے چھلّوں کو ماہتاب سے تشبیہ دی ہے

مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار (۱) ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو تو وا کرے اُس عقدہ کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر (۲) گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مُریدی ترا فرمانِ الٰہی (۵) ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلان تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں (۱۰) نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بشارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہانتاب مُبارک! غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

(۱) یہ قطعہ نوروز کی مبارکباد پر مشتمل ہے اور نوروز برُجِ حمل میں داخلے کے وقت منایا جاتا ہے مرزا صاحب مجروح کو لکھتے ہیں:
تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوئی اور کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے اس سے تجاوز نہیں۔

(۲) فرماتے ہیں اس وقت تک حضرتِ خضر کا سکندر سے تیرا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے جب تک آبِ حیات سے زبان لب کو پاک کریں۔

(۵) توقیعِ امیری۔ امیری کی سند
فرماتے ہیں تیرا نقشِ مریدی فرمانِ الٰہی ہے یعنی جسے تو نے اپنی مریدی کی سند دیدی اسے گویا فرمانِ الٰہی مل گیا اور جسے تیرا داغِ غلامی میسر ہوا اسے امیری نصیب ہوگئی۔ مطلب یہ کہ تیری غلامی امیری سے بلند ہے۔

(۱۰) نوروز ماہ مارچ میں ہوتا ہے جبکہ آفتاب برجِ حمل میں آجاتا ہے اور یہ مہینہ موسمِ بہار کہلاتا ہے۔ اہلِ مشرق اس دن بڑے بڑے جشن کرتے ہیں۔ آفتاب کا برجِ حمل میں آنا تجھے مبارک ہو اور غالب کو تیرے بلند آستان کی زیارت مبارک ہو۔

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو (۱)   اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو   روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ (۲)   اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین   تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی   ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز   روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہُنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں   بادشہ کا غلامِ کارگزار

---

(۱) "اگرچہ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں کیا حال ہے؟ میرے چار خدمت گزار ہیں۔ چاروں روزہ دار آخر مجھ کو یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی نہ خس نہ خانہ نہ برف آب آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ "افطارِ صوم کی جسے دستگاہ ہو الخ"

رُباعی اور قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔

(۲) اس قطعہ کے لیے مرزا صاحب نے اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے "یار چھ مہینے پورے ہو چکے ہیں۔ ۲۰ر جولائی سے دسمبر تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہی مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو لکھوں گا۔ ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا ہے صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دیدوں گا اور آئندہ ماہ بہ ماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔"

اور جب بابر کا حال شاہ کے حضور میں پیش کیا تو اس کے ساتھ یہ منظوم درخواست بھی گزاری، اور بعد میں مرزا صاحب کی تنخواہ ماہ بہ ماہ قرار پائی، "اُس سبب سے فرصت تم کو خط لکھنے کی نہ ہوئی۔"

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح　　تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر　　نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ (۳)　　مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں　　ذوقِ آرایشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر　　تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

---

(۳) اس شعر کو مرزا صاحب نے نواب کلب علیخاں کے حسب خط میں استعمال کیا ہے۔ اس کا عکس ملاحظہ فرمائیے:

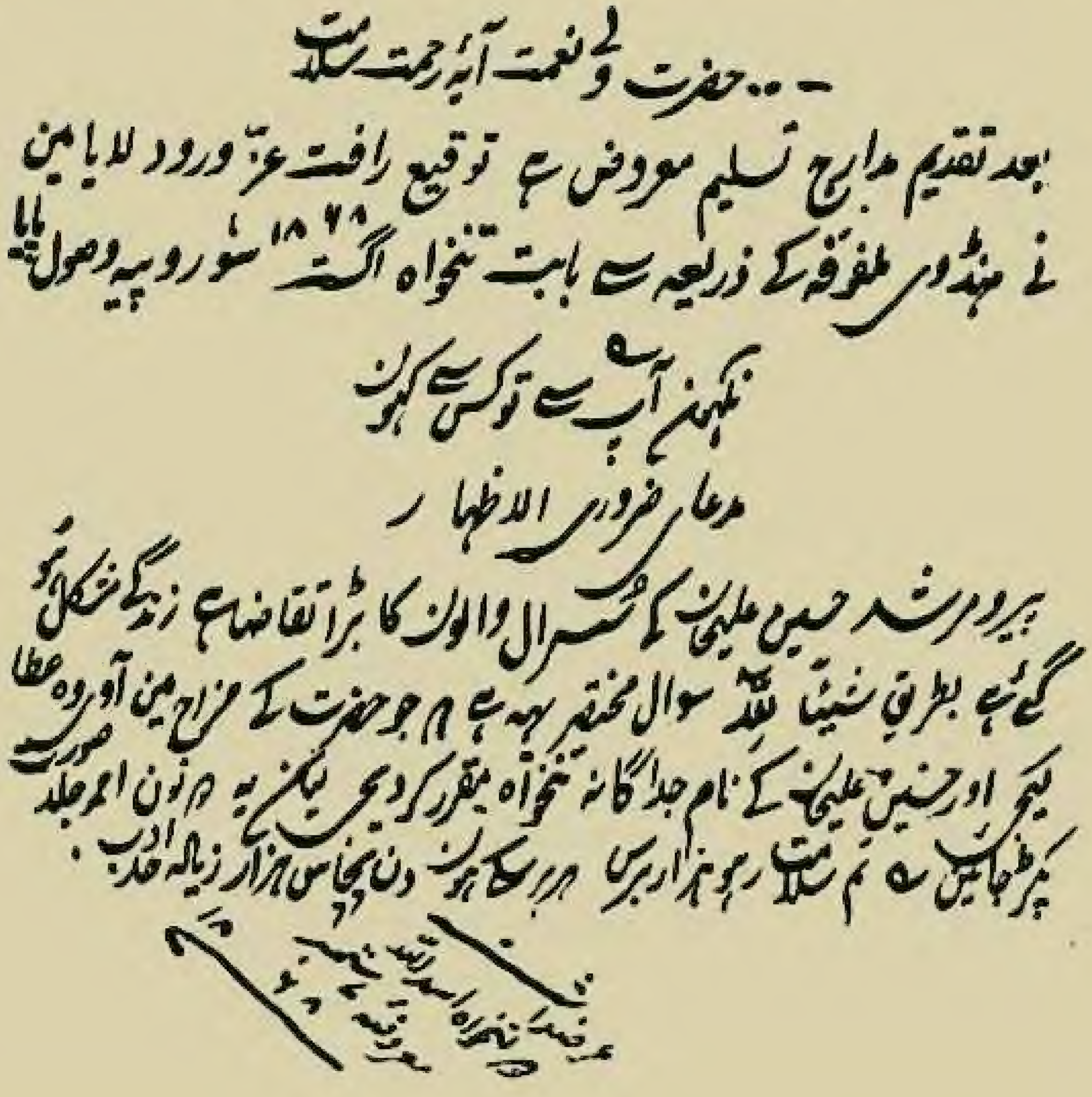

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تقدیم مراسم تسلیم معروض ہے توقیع رافت عزِ ورود لایا میں نے ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعہ سے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۶ء سو روپیہ وصول پایا

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں

مدعای ضروری الاظہار

پیر و مرشد حسین علیخاں کی سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے زچگی نزدیک ہو گئی ہے بطریق شبیہ یہ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے وہ عطا کیجیے اور حسین علیخاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار زیادہ حد ادب

[illegible]

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دُھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان؟ دُھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار؟
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہُوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام شاعری سے مُجھے نہیں سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہُوں لازم ہے میرا نام نہ لے (۱) جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

سہل تھا مُسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی (۲) مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دِن مُسہل سے پہلے تین دِن مُسہل کے بعد تین مُسہل تین تبریدیں یہ سب کَے دن ہوئے

خجستہ انجمن طُوے میرزا جعفر (۳) کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسی ہی فرخندہ سال میں غالبؔ قطعہ تاریخ نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محفوظ
۱۸۵۴ء

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی (۴) ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے؟ تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں (۵) دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام اِس سے ہے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

(۱) سیہ گلیم یعنی سیہ پوش، مراد سیاہ بخت۔ فرماتے ہیں: اگر دنیا میں کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے تو مجھ سیاہ بخت کا نام نہ لے۔ اگر میرا نام لے گا تو کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ مَیں وہ ہوں جسے کبھی کسی پر غلبہ حاصل نہیں ہوا جو شخص میرا شریک ہوتا ہے اس کا حصہ ہمیشہ مجھ سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) مُسہل لینا تو آسان ہے لیکن یہ سخت مشکل آپڑی ہے کہ بادشاہ کے دربار میں غیر حاضر رہنے سے میری کیا حالت ہوگی۔ مُسہل لینے سے پہلے تین دن منضج پیوں گا اس کے بعد تین دن مُسہل ہوں گے پھر تین تبریدیں ہوں گی گویا اس طرح بارہ دن غیر حاضر رہوں گا۔

(۵) بادشاہ کے دربار کے یہ آداب تھے کہ آپس میں جو دربار دار وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ داہنے کان پر رکھ لیتے تھے کیونکہ اردو محاورے میں کان پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔
اس لیے مرزا صاحب نے اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے گو سب خانہ زاد غلام ہیں لیکن سلام کرتے ہوئے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم آشنا نہیں ہیں۔

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم اے عمرِ گزشتہ ایک قدم استقبال

شب زُلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا کیا شرح کروں کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرۂ اشک، دیدہ پُرنم تھا

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلی افسوس! تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لیے

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب! منہ بند ہو گیا ہے گویا

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال (۱) ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا کیونکر مانوں، کہ اُس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ (۳) آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے (۵) بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیں گے ہم دعائیں سو بار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

---

(۱) بادشاہ کے یہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو شاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اس کے شکریہ میں کہی گئی۔

(۳) مرزا نے حقیر کو لکھا: یہ رباعی اور یہ قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا۔ "بہت ہنسے اور خوش ہوئے"۔

(۵) بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا تھا اس کے شکریہ میں یہ رباعی کہی تھی۔ سیم کے بیجوں کو فیروزہ کے دانوں سے تشبیہ دی گئی ہے

تتمّہ

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

گلکدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ ایک بُو
ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک

مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
مے کدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زباں کو، غالبِ خاکسار ایک

یہ غزل مرزا صاحب کے قیامِ کلکتہ کے زمانے کی ہے اور متفرقاتِ غالب میں شائع ہو چکی ہے۔ طپاں کا نام مرزا احمد خاں بیگ دہلوی ہے اور انھوں نے مارچ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا ہے۔ قاسم کا پورا نام بہادر شاہ کے روزنامچے شائع کردہ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے اس اندراج سے معلوم ہوتا ہے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کو مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں مرحوم وقائع نگارِ سلطانی نے بعرضِ دبار بیضہ ایک دن میں انتقال کیا۔ (از نسخۂ عرشی)

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں!
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں؟
نہیں کرنے کا مَیں تقریر ادب سے باہر
مَیں بھی ہوں واقفِ اسرار کہوں یا نہ کہوں؟
شکوہ سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں؟
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نپاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں؟
دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں؟
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں درپسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں؟
آپ سے وہ مرا احوال نپوچھے تو اسدؔ!
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہہ اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
ازبسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سُبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیے، نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقہ میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں، مَیں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

مجلسِ شمعِ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہو رہے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گذرگاہ میں مَیں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سُبک رَو کے نہ رہنے سے ہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

قطعہ

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے (۱)   جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے   اخلاص کا ہوا ہے اسی مُلک میں ظہور
ہے اصل تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے   پھیلا ہے سب جہاں میں یہ میوہ دُور دُور

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ   ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ
خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج   کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر   ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حُسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام   جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ
مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا   رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیمتن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر   اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ
ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب   اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ
بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا   کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک   رکھو نہ شمع پر اے اہلِ انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے لیکن   اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آ گیا جو پس از قتل میرے قاتل کو   ہوئی ہے اُس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیّت کا   کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ
روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام"   اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"
ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں   فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

---

(۱) "ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے ایک مضمون سوسائٹی کے جلسہ میں پڑھا بقول اسد اللہ خاں اس ملک کے آدمی احسان فراموش نہیں ہیں۔ جو شخص ان سے ذرا سی محبت کرتا ہے یہ اُس سے صد چند محبت کرنے کو تیار ہیں۔ اور مندرجہ بالا قطعہ از مرزا غالب بھی پڑھ کر سنایا۔"

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی (۱)   تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ!   ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی
تم ہو بُت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟   تم خداوند ہی کہلاؤ، خُدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی   آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا   کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!   خُلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!   سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں   زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے، غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی   ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

آپ نے مَسّنیَ الضُّر کہا ہے تو سہی (۲)   یہ بھی یا حضرتِ ایوب! گِلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر   ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر   نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری   نہ سہی ایک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے، دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے   نہ سہی ہم سے، پر اس بُت میں وفا ہے تو سہی

(۱) یہ غزل مرزا غالب نے نواب علائی کے اصرار پر کہی تھی اور اُن کے والد ماجد نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کو ارسال کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "وکیل حاضر باش دربار اسداللہ یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اُردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے مطرب کو سکھائی جائے، جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا جاڑوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔"

(۲) حضرت ایوبؑ کا صبر مشہور ہے۔ خدا نے اُن کا امتحان لینے کے لیے سخت بیماریوں میں مبتلا کر دیا مگر اُن کے صبر میں لغزش نہ آئی۔ آخر میں غیبی آواز آئی کہ اے ایوب زمین پر ٹھوکر مارو۔ ٹھوکر مارنے سے چشمۂ آب پھوٹ پڑا جس کے غسل سے صحت یاب ہو گئے اور مال و دولت و اولاد سے سرفراز ہوئے۔

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں مَیں   کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آ جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ   شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے   جان جلے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے
اُن کو کیا علم، کہ کشتی پہ مری کیا گزری (۹)   دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ!   ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اٹھتے ہیں   "لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے"
دیدہ خونبار ہے مدت سے، و لے آج ندیم!   دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں   عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ   آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

دیکھ وہ برقِ تبسم بسکہ دل بیتاب ہے   دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش   "اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے"

ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے اسدؔ!   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

(۹) یہ وہی شعر ہے جو الہامی کیفیت رکھتا ہے اور جس کا ذکر غالب کے خود نوشتہ خط بنام نواب کلب علی خاں میں بسلسلۂ غزل مطلع "گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے" آگے آئیگا۔ جب کہ مرزا غالب رامپور سے واپس آ رہے تھے اور مراد آباد میں کشتیوں کا پُل ٹوٹ جانے کا حادثہ پیش آیا۔ ملاحظہ ہو صفحہ!

خمسہ بر غزل بہادر شاہ ظفرؔ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی   مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی   کھینچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشقِ دل گیر آدھی رہ گئی"

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پُرنم اُس کے رُوبرو   کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے رُوبرو!
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اُس کے رُوبرو   کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے رُوبرو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی"

تو نے دیکھا! مجھ پہ کیسی بن گئی اے رازدار!   خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار؟
مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار   کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویرِ یار
جاگ اُٹھا جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی"

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے یوں اے دل نواز   مستیِ چشمِ سیہ سے چل کے ہو دیں چارہ ساز
تو صداے پا سے جاگا تھا جو محوِ خواب ناز!   دیکھتے ہی اے ستمگر تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی"

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات   جس کے حُسنِ روز افزوں کی یہ ادنیٰ ہی بات
ماہِ نو نکلے پہ گزری ہوں گی راتیں پانچ سات   اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی"

تا مجھے سنبھلے کا ہوش، بخت بد ہے گھات میں   ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
بجز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں   کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی"

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے گلے لگ جائے   آدمی کو کیوں پکارے ہے گلے لگ جا رے
سر سے گر چادر اُتارے ہے گلے لگ جائے   "مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے گلے لگ جا رے
وصل کی شب، اے بُت بے پیر آدھی رہ گئی"

میں یہ کیا جانوں، کہ وہ کس واسطے یوں پھر گئے   پر نصیب اپنا انھیں جاتا سنا، جوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے   "آ کے آدھی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی"

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو یارب! کب کی بات   کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں؟ ہاں وہ پرسوں شب کی بات   "نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی"

ہو تجلّی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب   ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب   "پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصفِ شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو، دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر   ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اُس کے گھر!
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں مگر   "دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفرؔ
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی"

یہ مخمس مرزا غالب نے بر غزل بہادر شاہ ظفر لکھا تھا اور یہ مخمس تمہ دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۰ رجب ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور بقولِ عرشی صاحب "یہ مخمس اُسی وقت کا لکھا ہوا ہے"۔

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن برونِ والا جاہ
بلند رُتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر!
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کُلاہ
وہ محضِ رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پُرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرِ کاہ
زمیں سے سُودہ گوہر اُٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اُسکے جولاں گاہ
وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں "الٰہی شکر"
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے "خدا کی پناہ"
یہ اُس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سرِ راہ
ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی دُمِ روباہ
نہ آفتاب، و لے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، و لے مرتبے میں ہمسرِ شاہ
خدا نے اُس کو دیا ایک خوب رُو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
زہے ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اُس کا تارِ نگاہ
خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اُس کا بازی گاہ
جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اُس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

یہ قصیدہ مرزا صاحب نے منشی شیو نراین کی طرف سے مسٹر ایلن برون کے فرزند تولد ہونے کی مبارکباد پر لکھا تھا چنانچہ منشی جی کو خط میں لکھتے ہیں: "کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ لکھ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً مرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں روشِ خاص سے سنہ ۱۸۵۸ء کا اظہار کر دیا ہے۔ خدا کرے تمہارے پسند آوے۔ خود قدر دانِ سخن ہو اور میں استادِ اس فن کے تمہارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔" مرزا غالب کا بھیجا ہوا یہی قصیدہ منشی شیو نراین آرام نے مسٹر ایلن کو پیش کیا۔

کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ" لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ
عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ
ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ
یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس یہ لے گا بادشہِ چین سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں دراز اس کی ہو عمر اس قدر سخن کوتاہ
امیدوارِ عنایات "شیو ان" کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عز و جاہ کے ساتھ تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروزِ شمار ہوا کرے گی ہر اک سال، پیشکار گرہ
یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تاگا یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بیشمار گرہ
گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ
دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا کہ دیکھ کتنی اُٹھا لائے گا، یہ تار گرہ
کہا، کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ
خود آسماں ہے بہار راؤ راجہ پہ صدقے کرے گا سینکڑوں اس تار پر نثار گرہ
وہ راؤ راجہ بہادر، کہ حکم سے جن کے رواں ہو تار پہ فی الفور دانہ وار گرہ

یہ قصیدہ راجہ شیودان سنگھ والی الور کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مصرعہ اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی بیسویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تھا چونکہ وہ راجہ بنی سنگھ کے ۱۸۵۷ء میں مرنے پر ۱۲ برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے اور ستمبر ۱۸۶۳ء کو بلوغ کو پہنچے تو با اختیار کیے گئے۔ اسی موقع پر یہ قصیدہ لکھا گیا۔

انھیں کی سال گرہ کے لیے ہے سال بسال   کہ لائے غیب سے غنچوں کی نوبہار گرہ
انھیں کی سال گرہ کے لیے بناتا ہے   ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار گرہ
انھیں کی سال گرہ کی یہ شادمانی ہے (۴)   کہ ہو گئے ہیں گہر ہائے شاہوار گرہ
انھیں کی سال گرہ کے لیے ہے یہ توقیر   کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار گرہ
سُن اے ندیم برس گانٹھ کے یہ تاگے نے   تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
پئے دُعائے بقائے جنابِ فیض مآب   لگے گی اس میں ثوابت کی اُستوار گرہ
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی   بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو   کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ
کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانہ میں   بچے نہ از پئے بندِ نقاب یار گرہ
متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا   کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ
خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہِ سخن   کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسار گرہ
کہاں مجالِ سخن سانس لے نہیں سکتا   پڑی ہے دل میں مرے غم کی پیچ دار گرہ
گرہ کا نام لیا پر نہ کر سکا کچھ بات   زباں تک آ کے ہوئی اور اُستوار گرہ
کھلے یہ گانٹھ تو اللہ دم نکل جاوے   بری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ھار گرہ
اِدھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک   کبھی کسی سے کھُلے گی نہ زینہار گرہ
دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں ازرہِ بغض   پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ
دل اُس کا پھوڑ کے نکلے بشکل پھوڑے کے   خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھار گرہ

(۴) یہ شعر مالک رام جی کے مرتبہ دیوان میں پایا نہیں جاتا جبکہ نسخہ عرشی صاحب میں موجود ہے۔

قصیدہ

کرتا ہے چرخ، روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نوابِ مستطاب، امیرِ شہِ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
تُرکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حُسام
جس بزم میں کہ ہو اُنھیں آہنگِ میکشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چار دہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزّ و جاہ رہیگا علی الدّوام
سچ ہے، تُم آفتاب ہو جسکے فروغ سے
دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو! کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ اَنام
اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہُوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستین ہے مگر تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آ گئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
لمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اُس بزمِ پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
لمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام
سمجھا اُسے گر اب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اُس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا، وقت ریل کے کھُلنے کا بھی قریب (۱)
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام
اس کشمکش میں آپ کا مداحِ دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
جو واں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
مُلک و سپہ، نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں
سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریہ کا دہر میں، جو مدح خوان ہو
شاہانِ عصر چاہیے لیں عزت اُس سے وام
خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام
امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدہ کا چاہیے، قیام
ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دُعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام
ہے یہ دُعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

قصیدہ

مرحبا سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز افتخارِ لیل و نہار
مہ و سال اشرفِ شہور و سنین
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

(۱) مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا جسے رسالہ "زمانہ" کانپور جولائی ۱۹۱۳ء میں نقل کیا گیا۔ ان کے انیسویں شعر میں ریل کے کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتہ سے رانی گنج تک جو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے جاری ہوئی تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلّی تک جاری رہا۔ پہلے آگرہ سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلہ جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے شرقی کنارے جولائن تک کا حصہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ ۱۸۶۶ء کے اخیر میں یہ پل بن کر تیار ہوا اور یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری۔

جو اس اکیس دن میں ہولی کی جابجا مجلسیں ہوئی رنگیں
شہر میں کُو بکُو عبیر و گلال باغ میں سُو بسُو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تہوار اور ایسے خوب جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں امیرِ شاہ نشاں رزم گہ میں حریفِ شیر کمیں
پیشگاہِ حضور شوکت و جاہ خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں گوشہ جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجمیں چرخ گوہر آگیں فرش نورے ماہِ ساغرِ سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطائے بذل کرم کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ ثمیں
نغمۂ مُطربانِ زہرہ نوا جلوۂ لُولیانِ ماہ جبیں
اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سَروَرِ مہر فر ہوا جو سوار بکمالِ تجمل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن   اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یکسر   بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مشک فشاں   رہرووں کے مشام عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت   فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا   جس طرح ہے سپہر پر پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام   ران پر داغِ تازہ دے کے دیں
اور داغ آپ کی غلامی کا   خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور شناطرازی ہے   مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا منہ   گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے   ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی خدا کی پناہ!   دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا   ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں
مدح گستر نہیں دعا گو ہے   غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دُنیا میں   تم رہو زندہ جاوداں آمیں

کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا غالب نے نواب کلب علیخاں کے غسلِ صحت کی تقریب پر لکھا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے اس قصیدہ کو نواب یوسف علیخاں کے غسلِ صحت کی تقریب پر بھیجا تھا جیسا کہ خط بنام مرزا غالب میں، نواب یوسف علیخاں نے اس قطعہ کی تعریف میں یوں تحریر فرمایا ہے: "ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارکباد کا جو آپ نے بھیجا ہے وہ پہنچا اس کے آنے سے سرورِ صحت دوبالا ہو گیا۔ ایسی نظم ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں حقا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے جس کمال کو دیکھیے اس میں آپ کی ذات فردِ کامل ہے۔ آپ کا ہر مصرعہ اکثر نقلِ محفل رہتا ہے۔ جو سنتا ہے جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے تب کہیں ایک شخص کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللّٰہم صحت ذات طولِ عمر عطا کرے اور تا دیر گاہ اہلِ جہاں آپ کی ذات سے مستفیض ہوا کریں۔ باقی خیریت ہے۔" (بہت خوب)

مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں
بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی تیری ان سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے
قہر ہے دل ان میں اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

اس مثنوی کے بارے میں خواجہ حالیؔ مرحوم نے لکھا ہے

منشی بہاری لال مشتاقؔ کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے ایک بار دلیؔ میں آئے اور مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ انہوں نے وہ مثنوی مرزا صاحب کو دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس کے آخر میں یہ فارسی شعر لاحق کر دیا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ مرزا صاحب کی عمر بارہ برس کی تھی۔

قطعات

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہوا برِ مطیر؟
پیالہ لا، مئے گلنار گوں، ببار برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
"امیرِ کلبِ علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

یہ قطعہ مرزا غالب نے نواب کلب علی خاں کو بھیجا تھا لکھتے ہیں،

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عز ورود لایا اگرچہ مینہ اس قدر برسا ہے جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں۔ مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے ابر رحمت کے شکریہ میں قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظرِ اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ قطعہ مرزا صاحب کا خود نوشتہ ہے ←———

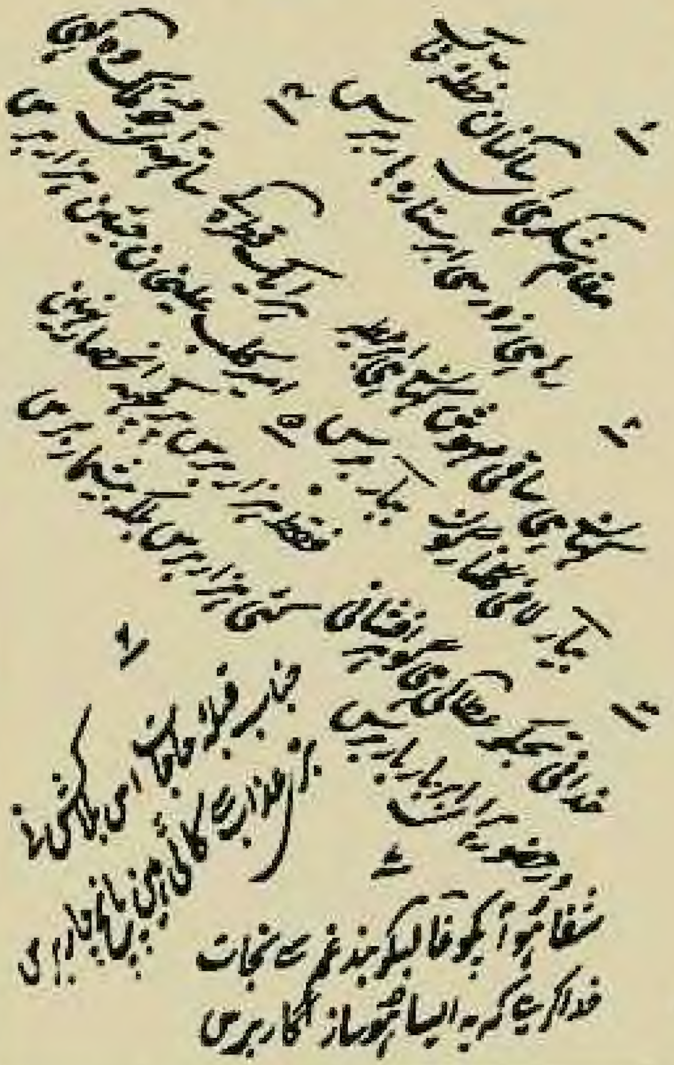

شفا ہو آپکو غالبکو بند غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

قطعہ

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور ایک بڑا باغ ہے از رہے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے باہم
صبحدم باغ میں آجائے جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراقِ رقم
حق سے کیا مانگیے، ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلب گار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

مرزا صاحب اس قطعہ کے متعلق نواب کلب علی خاں والی رامپور کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے کہ ایک قطعہ ۱۵ اشعار کا بھیجتا ہوں، حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ قطعہ مرزا غالب کا خود نوشتہ ہے جو انھوں نے نواب کلب علی خاں کو روانہ کیا تھا۔

قطعہ

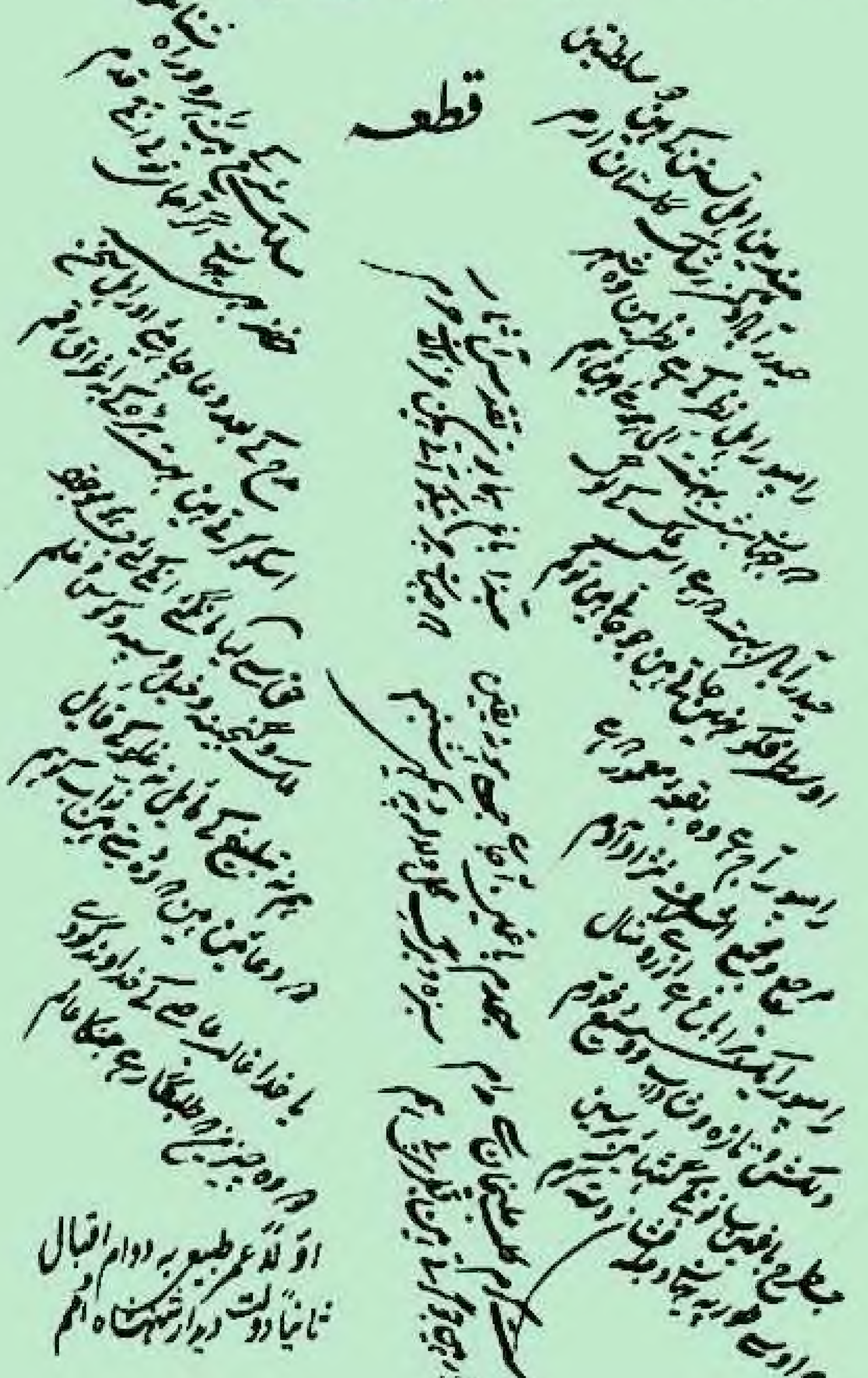

قطعہ تاریخ اختتامِ کتاب تکشیف حکمت

سلیم خاں، کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام
تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش ہوئی ہے مُبدءِ عالم سے اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اسکے ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے اک اس نے کہ جس میں حکمت طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد، کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے "لکھا ہے نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام
۱۲۷۹

اے جہان آفریں خدائے کریم قطعہ صانعِ ہفت چرخ ہفت اقلیم
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شاد مان رہیں اور غالب پہ مہربان رہیں

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم (۱۲) قطعہ عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلمدان ہے نذر (۱۳) مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

(۱۲-۱۳) مولف تحفۂ تحمید نے لکھا ہے کہ: رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب جو مولف کے چچا تھے، غالب مرحوم کی پہلی ملاقات کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں کہ: جب ہم گوڑگانوے میں ہیڈ ماسٹر تھے وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر کووان صاحب کی تبدیلی کا موقع پیش آیا۔ صاحب موصوف ہمارے حال پر خاص نظرِ عنایت رکھتے تھے ان کی مفارقت کے متعلق جو جلسہ قرار پایا اس میں لوگوں کی رائے ہوئی کہ صاحب ممدوح کو کوئی چیز بطورِ یادگار نذر دینی چاہیے۔ چنانچہ کمیٹی کی رائے سے چاندی کا قلمدان تجویز ہوا۔ قلمدان پر کوئی شعر بھی کندہ کرانا تھا اور اسی سلسلہ میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کا مرزا غالب کے پاس آنا ہوا اور یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی جس کے بعد دونوں کے باہمی مراسم اتنے بڑھ گئے کہ مرزا غالب ماسٹر پیارے لال کو فرزندِ ارجمند لکھا کرتے تھے۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا (۱)
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ!
مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی!
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گُہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانبارئ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ہمنشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدیں خاں
بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے، زُہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لیے میں نے جو اُٹھایا سہرا

(۱) شہزادہ جواں بخت کی تقریبِ شادی پر سب سے پہلے مرزا غالب نے سہرا لکھکر حضور میں گزرانا۔ مگر مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات آگئی تھی۔ ہم سخن فہم ہیں الخ۔ اس مقطع کو سُن کر بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ چشمک ہم پہ ہے لہذا جب ذوق آئے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک سہرا تم بھی کہدو مگر مقطع کا خیال رکھنا۔ اسکے بعد ذوق نے بھی حریفانہ سہرا لکھا۔ ان سہروں کا شارحین نے موازنہ کیا ہے مگر غالب کا سہرا نہایت عمدہ و لطیف ہے غالب سے پہلے کسی نے سہرا نہیں لکھا اور یہی سہرے کے موجد ہیں۔

قطعہ تاریخ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب   آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں مجھ کو   ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو   دیے ناگاہ مجھ کو دکھائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا   باہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم   بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو   ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ   بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم   جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ   جس سے یماں کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے   جو ائمہ کے ہیں تولائی

خطِ منظوم بنام علائی

بسکہ فعال ما یرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زُہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک   آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا!   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ   سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم   ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب   کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے (۱)
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دِلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو، کہ ہاں!
ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

اے نغمیٔ خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو قطعہ
عُصفُور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ
لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

کیا ان دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں قطعہ
کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں
جانا بچشمِ شوق، جو موسے نے طور پر
یاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں
یہ تمکنت و وقار، علائی! یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور تمہارے دماغ میں

(۱) یہ قطعہ مرزا غالب نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو بھیجا تھا جواب مولانا علائی نے برنگِ غالب ہی خوب لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے
کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں کیا خوب ہے
کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں
کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈال پر سبز آم
وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول
وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحمِ طری
کہ کیا کیا اُسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں
کہیں ان کو بے مہر کاہل اگر
لوہارو وہ اس بات پر بھی نہ آئیں

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا
ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اُسے، کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو
نہ بادشاہ نہ سلطاں، یہ کیا ستایش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی ؟
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں، حسینؑ ابنِ علیؑ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو
کفیلِ بخششِ امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو
مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

سید محمد صاحب مرحوم نے مرزا سے خواہش ظاہر کی کہ جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ مرزا کو اُن کی بہت تعظیم تھی مگر اُس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا جب فرمایش پر یہ تین بند لکھے اور مجتہد العصر کی خدمت میں لکھدیا "یہ تین بند امتثالِ امر کے لیے لکھے ہیں۔ میں اس میدان کا مرد نہیں اس کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے"۔ نیز ریاض الدین امجد اپنے سفر نامۂ دہلی میں لکھتے ہیں کہ میں مرزا غالب کی ملاقات سے شرف یاب ہوا۔ مرزا نے تین بند مرثیہ کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلائے میں نے بند طلب کیے۔ مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر دیے۔ ان کا قول تھا: یہ حصہ انیس و دبیر کا ہے۔

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل   شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو
عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات   کہ جنّ و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو
بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؓ بلند   بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرّۂ خاک   کہ نوکِ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو
ہمارے درد کی یارب، کہیں دوا نہ ملے   اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کی داد!   مگر نبیؐ و علیؓ مرحبا کہیں اس کو
زمامِ ناقہ کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں   پس از حسینؓ علیؓ پیشوا کہیں اس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے   کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد   پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں   علیؓ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ   بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اس کو
علیؓ کے بعد حسنؓ اور حسنؓ کے بعد حسینؓ   کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے   رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو
بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد   غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے   قطعہ   ثاقب! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب   غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدیں خاں!   کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟   سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی!   شیعی کیونکر ہو، ماوراء النہری؟

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل   بادہ غالب! عرقِ بید نہیں
ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو   برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو
بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر   کہ چشمِ تر میں ہے ہر یک پارۂ دل پائے در گل ہے
شمشیرِ صافِ یار، جو زہرآب دادہ ہو   وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو
دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو   آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو
ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے   یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے
جگرے ٹوٹے ہوے مُو کی ہے سناں پیدا   وہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسباب ہوس بہتر   جو ہو جاوے نثارِ برق، مشتِ خار و خس بہتر
یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط   کی تصور نے بہ صحرائے ہوس رہ غلط
ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب   (۱۰) نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب
خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر   "فروغِ مہر" میرزا حاتم علی مہر
ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک   (۱۲) عنایاتِ الٰہی ہو مبارک
دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا   دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

سہ ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے الخ

(۱۰) کسی موقع پر خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی خصوصیات پر دربار میں تذکرہ ہو رہا تھا مرزا غالب نے اسی وقت یہ شعر پڑھا۔

سہ خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر الخ

مرزا غالب نے حاتم علی مہر کی مثنوی شعلۂ مہر کو پڑھ کر یوں لکھا "مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔ اگر اس انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اردو کہلائے گی۔

(۱۲) سہ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک الخ   یہ شعر مرزا صاحب نے نواب علائی کو ایک خط میں بطورِ سرنامہ لکھا تھا۔

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے
زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے
دورنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا
پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفیِ غیر نے
آیا ہر ایک مکان نظر لامکاں مجھے
پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تانک کی
روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بےخبر
آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
(۱۰) عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے
ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے
فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات
کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی
جب کہ سید غلام بابا نے ق
مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات
کہ کواکب ہوئے تماشائی

(۱۰) دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے الخ
یہ شعر انتقال سے قبل اکثر مرزا کے وردِ زبان رہتا تھا۔

ہزار شکر کہ الخ

جبکہ سید غلام بابا نے الخ

ق یہ دونوں قطعات مرزا غالب نے بتقریبِ شادی سید غلام بابا رئیسِ سورت لکھے تھے مگر تاریخِ نکاح نہ لکھنے کا عذر کرتے ہوئے لکھا: وہ دوست جو مادہ ڈھونڈھ لیتے تھے وہ جنت کو سدھارے معذور ہوں اور مجبور ہوں۔

درم ودام اپنے پاس کہاں (۱) چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں
پیرومرشد معاف کیجیے گا (۲) میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال
سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس (۳) بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
سات جلدوں کا پارسل پہنچا (۴) واہ کیا خوب بر محل پہنچا
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں (۵) کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں
تحریر ہے یہ غالب یزداں پرست کی (۶) تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی
مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے (۷) یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے
آج یکشنبہ کا دن ہے آؤ گے (۸) یا فقط رستہ ہمیں بتلاؤ گے
کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم (۹)

(۱) درم ودام اپنے پاس کہاں الخ ایک دن حسین علی خاں کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگاؤ اور پیسوں کی تلاش میں صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا تو مرزا غالب نے یہ شعر پڑھا۔

(۲) مرزا غالب نے نواب انور الدولہ شفق کو جو خط لکھا اُس کے متن مطبوعہ عود ہندی میں یہ شعر سرآغاز نامہ ہے۔

(۳) یہ شعر مرزا غالب نے اپنے خط میں صفیر بلگرامی کو لکھا تھا۔ جوابی اشعار یہ ہیں:
سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب ؛ بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس۔ مگر یہ کہتے ہیں اہل دین کی ہے دعا، خدا کرے مرزا غالب جیے ہزار برس

(۴) مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو خط میں لکھا "بھائی جان کل جو جمعہ روز مبارک و مسعید تھا گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن آئے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام سات جلدوں الخ

(۵) یہ شعر غالب نے میر مہدی مجروح کو ایک خط کے شروع میں لکھا تھا؟ خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔

(۹) یہ شعر منظوم سوال و جواب کا آخری شعر ہے جو مرزا غالب نے کلکتہ یونیورسٹی کے لئے رائے بہادر پیارے لال کو بھیجا۔

(۷) مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنالیا ہے الخ یہ شعر مرزا غالب نے اپنی آخری جائے رہائش واقع گلی قاسم جان، عقب مسجد متصل دیوان خانہ حکیم محمود خاں کے متعلق کہا تھا

(۸) آج یکشنبہ کا دن الخ ماسٹر پیارے لال آشوب اپنے دوران قیام دلی ہر ہفتہ مرزا صاحب کی ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ جب کبھی ان کو دیر ہو جاتی تو مرزا غالب ایک نہ ایک شعر لکھ رکھتے تھے جس کا مقصد حسن طلب ہوتا۔

(۵) صفیر بلگرامی جب مرزا غالب کی ملاقات کو گئے اور نواب ضیاء الدین کے یہاں ٹھیرنے کا بندوبست ہوا تو کھانے کے ساتھ جو آم چنے گئے رہ گئے تھے۔ صفیر جو ٹوکرا اپنے ساتھ لائے تھے نصف مرزا کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے یہ مصرعہ لکھا ہوا آیا۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا (۱) آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں (۲) دلی والوں میں ایک بچا ہے یہ

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے (۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

گو نہ ملتے تھے پر اک شہر میں رہتے تھے (۴)

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسدؔ میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل (۶) کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

---

(۱) مرزا غالب میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں: "رئیس دربار والے، مہاجن لوگ سب موجود، اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلیماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسدؔ، تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم۔ توڑ بیٹھے الخ

(۲) میر مہدی کو لکھا: "یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میرؔ کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بتغیرِ الفاظ لکھتا ہوں "کیوں نہ میرن کو" الخ میر تقی کا مقطع یوں ہے ؎ میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں ؛ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ ۔ "میرؔ" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی "بچا" کیا اچھا تصرف ہے۔

(۳) میر مہدی کو لکھتے ہیں: "میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے

(۴) نواب امیر الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں: "تمہارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا گو نہ ملتے الخ بھائی ایک سیر دیکھ رہا ہوں، کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ تو صاحب اب کب وعدہ وفا کرو گے؟"

(۶) منشی نبی بخش حقیر کو ہر گوپال تفتہ کے دیوان کا دیباچہ لکھنے کے عذر میں تحریر فرماتے ہیں: "رہا دیباچہ۔ تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں۔ گیا ہو جب الخ یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھے معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے" پھر لکھا ہے: "دیباچہ لکھنا بھائی کیا آسان ہے کلیجہ گھر جاتا ہے۔"

قادر نامہ

(قادر اللہ) اور (یزداں) ہے خدا
ہے (نبی مُرسل) پیمبر رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام)
وہ رسول اللہ کا قائم مقام
(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ)
ہے محبت (مہر) لازم ہے نباہ
نیولا (راسو) ہے اور (طاؤس) مور
(کبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
(خُم) ہے مٹکا اور ٹھلیا ہے (سبو)
(آب) پانی (بحر) دریا۔ نہر (جُو)
دودھ جو پینے کا ہے وہ (شیر) ہے
(طفل) لڑکا اور بوڑھا (پیر) ہے
(ماہ) چاند (اختر) ہیں تارے رات (شب)
دانت (دنداں) ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)
(استخواں) ہڈی ہے اور ہے (پوست) کھال
(سگ) ہے کتا اور گیدڑ ہے (شغال)
(چشم) ہے آنکھ اور (مژگاں) ہے پلک
آنکھ کی پتلی کو کہیے (مردمک)
لومڑی (روباہ) اور (آہو) ہرن
(شمس) سورج اور (شعاع) اسکی کرن
(پشہ) مچھر اور مکھی ہے (مگس)
(آشیانہ) گھونسلا۔ پنجرہ (قفس)
روئی کو کہتے ہیں (پنبہ) سُن رکھو
آم کو کہتے ہیں (انبہ) سُن رکھو
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ
فارسی (گلخن) ہے اور ہندی ہے بھاڑ
پایا قادر نامہ نے آج اختتام
اک غزل تم اور پڑھ لو۔ والسلام
علم ہی سے قدر ہے انسان کی
ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں
جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

یہ مثنوی خالقِ باری کی طرز پر ہے۔ قادر نامہ کے نام سے تحفئہ پریس میں چھپی تھی۔ مرزا صاحب نے یہ کتاب باقر علی اور حسین علی نواب عارف کے بچوں کے لیے لکھی تھی مثنوی کافی طویل ہے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں

مرتب مرقع غالب کی دوسری مطبوعات

شرح دیوان غالب (ہندی)

کلام غالب کی اردو شرحیں تو بے شمار پائی جاتی ہیں لیکن ہندی داں طبقہ کے لے ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جس سے ان کا ادبی ذوق پورا ہو سکے۔ لہذا مرتب موصوف نے اس اہم کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ زبان و بیان سادہ، سلیس مختصر اور پر معنی ہیں۔ کلام غالب کو بجا طور پر سمجھنے کے لئے اپنی قسم کا بے نظیر نسخہ ہے۔

قیمت مجلد سات روپے ۷/۵۰ سات روپے پچاس پیسے

فکر غالب

یہ کتاب "غالبیات" کے لٹریچر میں ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔ اس میں مرزا غالب کے حالاتِ زندگی، عادات و خصائل اور خصوصیاتِ کلام وغیرہ پر ہر پہلو سے سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مرزا غالب کے چند اہم خطوط بھی شامل ہیں اور دیوان کا انتخاب بھی۔ کہیں کہیں تنقیدی جھلک نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب قدردانِ غالب اور طلبار کیلئے ایک مفید ترین تحفہ ہے۔ قیمت چار روپے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ اردو بازار دہلی ۶

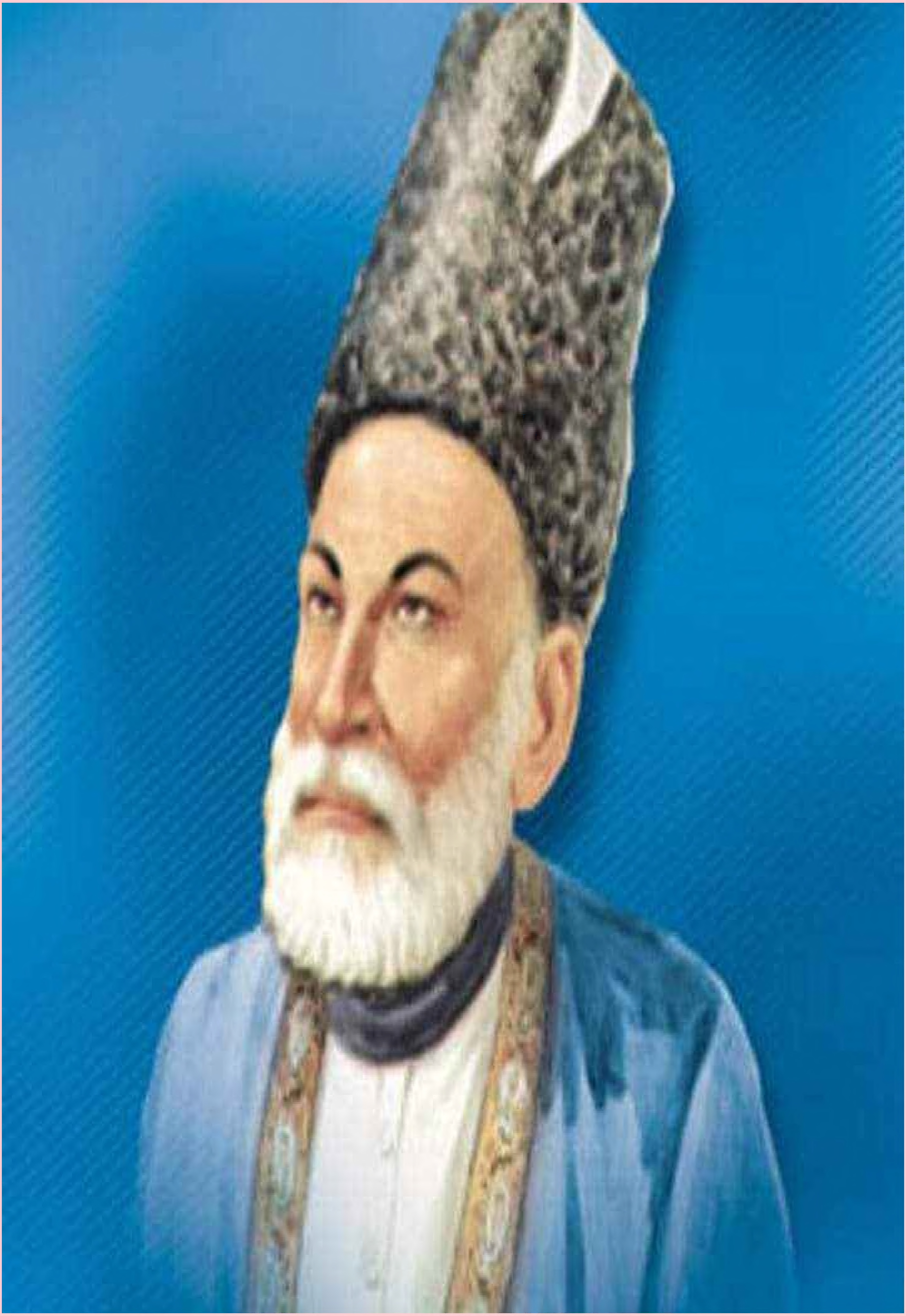لکشمی بک سٹور ۴۲ جن پتھ۔ نیو دہلی